رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر
سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)
چھ روپیہ (بغیر سالنامہ)

"مومن نمبر" دوسرا اڈیشن شایع ہوگیا
دو روپیہ علاوہ محصول

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی بہ سالہ دورِ تصنیف وصحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ واخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۲۰۶ صفحات مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات وجوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف۔ معجزہ وکرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب وعقل۔ طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم وتاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علمِ غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالمِ برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۶۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرتِ خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی ومعاشری مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیباتِ جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی ونفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ایک غلطی کا ازالہ

ستمبر کے نگار میں ایک مقالہ "اُردو ہندی نزاع" کے عنوان سے شایع ہوا ہے اور مقالہ نگار کے نام کی جگہ غلطی سے م - ج درج ہوگیا ہے - اس مقالہ کے مصنف شہباز حسین صاحب ہیں - خریداران نگار از راہ کرم اس کی تصحیح کرلیں - منیجر نگار

نگار

داہنی طرف صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا -

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۰	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۵۱ء	شمارہ ۴

ملاحظات ---------- ۲
وسط ایشیائی کلچری ترقی ... لطیف الدین احمد ------ ۵
انسان و انسان اعلیٰ ... مسعود جاوید ------ ۱۳
فنِ ڈراما نویسی ------ ابراہیم یوسف ------ ۲۱
عشق ---------- ۲۶
قیس اور امیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام ... شوکت بلگرامی ... ۲۹
بابُ المراسلۃ والمناظرہ ... فرمان فتحپوری - محمد عزیز حسن ---- ۳۱
بابُ الاستفسار ---------- ۳۶
اقتباسات ---------- ۳۸
مراسلات ---------- ۴۰
منظومات ... سیدہ اختر - محمود ایاز - رزم - شفقت - بشیر بدر - اکرم - سرور - ۴۲
مطبوعات موصلہ ---------- ۴۵

خریدارانِ نگار کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

۱- نگار کا سالانہ چندہ معہ سالنامہ کے (جس میں جنوری، فروری کے پرچے شامل ہوں گے) آٹھ روپیہ کردیا گیا ہے - لیکن جو حضرات سالنامہ لینا نہ چاہیں گے اور سال میں صرف دس پرچوں پر قناعت کریں گے ان کے لئے چندہ بدستور وہی چھ روپیہ رہے گا

۲- اگر آپ سالنامہ لینا نہیں چاہتے تو از راہ کرم جلد از جلد مطلع فرمائیے، کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے سالنامہ کی کاپیاں زاید نہیں چھاپی جائیں گی

۳- اگر آپ نے اطلاع نہیں دی تو سمجھا جائے گا کہ آپ سالنامہ لینا چاہتے ہیں اور وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہوتا ہے — ورنہ دو روپیہ چھ آنے کا وی پی جائے گا

۴- جو حضرات سالنامہ لینا پسند نہ فرمادیں گے اور اس کی اطلاع ہم کو دیدیں گے ان کی خدمت میں دسمبر ۱۹۵۱ء کے پرچے کے بعد مارچ ۱۹۵۲ء کا "نگار" بھیجا جائے گا

۵- مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دس مہینے کے سال کا چندہ چھ روپیہ ہے اور پورے بارہ مہینے کے سال کا چندہ آٹھ روپیہ ہے

۶- آیندہ سالنامہ ۱۹۵۲ء حسرت نمبر ہوگا

۷- پاکستان کے خریدار تمام رقوم ذیل کے کسی پتہ پر ارسال فرمائیں:-

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی - کراچی - اور ملک محمد دین اینڈ سنز، پبلشرز، مال روڈ - لاہور

ملاحظات

کانگرس دوراہے پر الکشن کا زمانہ جس قدر قریب آتا جاتا ہے، انتخاب کی سرگرمیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں متعدد سیاسی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کانگرس، دوسری کسان پرجا پارٹی، تیسری ہندو مہا سبھا، چوتھی سوشلسٹ، راشٹریا سنگھ کا ذکر میں اس لئے نہیں کرتا کہ وہ دراصل ہندو مہا سبھا ہی کا Trade name ہے۔ صرف لیبل بدلا ہوا ہے ورنہ چیز وہی ہے ـــ کمیونسٹ جماعت بھی چنداں قابلِ لحاظ نہیں، کیونکہ ابھی اس کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ انتخاب کے مقابلہ میں سامنے آسکے اور اگر کسی کمیونسٹ نے یہ ہمت کی بھی تو اسے سوشلسٹ جماعت کی حمایت حاصل کرنا ہوگی

ہندو مہا سبھا ـــ ایک قدامت پرست مذہبی جماعت ہے جو ہندوستان میں صرف ہندو راج، ہندو مذہب اور قدیم ہندو کلچر دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ پاکستان کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتی اور تقسیم ہند کی غلطی کا ازالہ وہ اس طرح چاہتی ہے کہ پاکستان کو فتح کرکے پھر بھارت میں شامل کرلیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ ہندوستان کی ۴ کروڑ مسلم آبادی یا تو ہندو مذہب اختیار کرے (حالانکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ صرف ایک سوشل تنظیم ہے) یا یہاں سے باہر نکل جائے

یہ وہ جماعت ہے جس کے اکثر افراد ہمیشہ کانگرس کے دشمن اور حکومت برطانیہ کے دوست رہے ہیں انھوں نے اس سے قبل ملک کی آزادی کے لئے ایک پھانس کی خلش بھی کبھی گوارا نہیں کی اور ہمیشہ سرمایہ داری کا ساتھ دیا۔ اس لئے حیرت ہونا چاہئے کہ وہ جماعت جو اپنی قوتِ عمل یا فکر و مطالعہ کے لحاظ سے اتنی قدامت پرست، اس قدر رجعت پسند اور اس درجہ بے عمل رہی ہو، اس میں آج یہ جرأت کیوں پیدا ہوگئی کہ وہ کانگرس حکومت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہے، پاکستان کو بھی فتح کرلینے کا ارادہ رکھتی ہے اور ۴ کروڑ مسلمانوں کو سرزمین ہند سے نکال کر یہاں خالص ہندو راج قایم کرنے پر بھی مصر ہے

اس میں شک نہیں ہندو مہا سبھا کی یہ ذہنیت ردِ عمل ہے برطانیہ کی اس منافقانہ حکمت عملی کا جو اس نے ہندوستان میں اختیار کی تھی اور جس کا تنہا مقصود ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دینا تھا، ہر چند یہ ذہنیت انگریزی راج ہی کے زمانہ میں کافی پختہ ہو چکی تھی، لیکن حکومت کے خوف سے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا جا سکتا تھا

جب ہندوستان آزاد ہوا، ملک دو حصوں میں بٹ گیا اور انگریز یہاں سے چلا گیا تو یہ سالہا سال کی دبی ہوئی چنگاری دفعتاً بھڑک اُٹھی، اور ہندوؤں کا جذبۂ انتقام مسلمانوں کے خلاف مختلف صورتوں سے رونما ہونے لگا

کانگرس یقیناً خالص سیاسی جماعت تھی اور مذہب سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا، لیکن اس کی یہ خصوصیت بھی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی اس کا ایک سبب تو وہی تھا جو ابھی عرض کیا گیا اور دوسرا یہ کہ کانگرس کے قیام کا جو مقصود تھا وہ ان کے نزدیک پورا ہو چکا تھا اور اب کسی مدعا کو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے کے لئے انھیں آسان ترین طریقہ یہی نظر آیا کہ ہندوستان کو خالص مذہبی حکومت میں تبدیل کر دیا جائے

وہ تو کہئے کہ مہاتما گاندھی کے بعد نئی قومی حکومت کی باگ جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں آئی، اور بین الاقوامی ساکھ پیدا کرنے کے لئے حکومت کا دستور لامذہبی اُصول پر مرتب ہوا، ورنہ جس خطرہ سے اس وقت ملک دوچار ہے وہ پہلے ہی سامنے آجاتا

اس دوران میں ایک عام شکایت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ کانگرس اپنے اُصول سے ہٹ گئی ہے اور اس کے ارکان میں خود غرضی، نفس پرستی، مادی طمع اور بد دیانتی بہت پیدا ہوگئی ہے پھر چونکہ حکومت کانگرس پارٹی کی ہے اس لئے یہ الزام گویا براہ راست حکومت پر عاید ہوتا ہے اور وہی ان شکایت کے ازالہ کی ذمہ دار ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت نظم و نسق کی اس خرابی کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور وہ اول دن سے اس گتھی کے سلجھانے کی فکر میں ہے کہ حکومت پر کانگرس کا اقتدار قایم رکھتے ہوئے کیونکر ان خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے اور ہر سال کانگرس کے اجلاس میں یہی سوال پیش ہوتا ہے

اور چند بے معنی تجویزوں کے سوا کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا جاتا۔ سال گزشتہ جب کرپلانی جی اور ٹنڈن جی کا مقابلہ تھا تو نہرو، کرپلانی جی کی موافقت میں تھے کیونکہ کرپلانی جی بہرحال ٹنڈن جی کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ آزاد خیال ہیں اور اس طرح یہ مقابلہ گویا رجعت پسند اور اصلاح پسند دو قوتوں کا مقابلہ تھا لیکن بدقسمتی سے رجعت پسند جماعت کو کامیابی ہوئی اور ٹنڈن جی کی صدارت نے اس گتھی میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ ٹنڈن جی گو ہمیشہ سے کانگریس کے آدمی رہے ہیں لیکن ان کی ذہنیت مہاسبھائی ہے اور گو انھوں نے اپنے دوران صدارت میں کوئی بات ایسی نہیں کی کہ حکومت سے کھلا ہوا تصادم ہو جاتا، پھر بھی ان کی صدارت کا جو عام اثر کانگریس پر پڑ رہا تھا وہ مہاسبھائی نوعیت کا تھا، اور جواہر لال نہرو ہائی کمانڈ اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کا بوجھ اپنے ضمیر پر بری طرح محسوس کرنے لگے تھے

اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جواہر لال کے بعض ساتھی ان سے اور کانگریس سے جدا ہو کر اپنا محاذ علیحدہ قایم کرنے لگے اور کانگریس کا مستقبل زیادہ تاریک نظر آنے لگا۔ جواہر لال کو چونکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اکثر ارکان سے جنھیں ٹنڈن جی نے منتخب کیا تھا اول ہی دن سے اختلاف تھا اور حالات زیادہ نازک ہوتے جا رہے تھے اس لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں تغیر و تبدل کا مطالبہ کریں اور بصورت عدم تبدیلی خود ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے استعفا دیدیں

جواہر لال نہرو کا یہ طرز عمل گویا ایک چیلنج تھا ٹنڈن جی کی پالیسی کے خلاف جس کے جواب میں ٹنڈن جی نے اس کو تو منظور نہیں کیا کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی ورکنگ کمیٹی میں کوئی تبدیلی کریں لیکن انھوں نے خود صدارت سے استعفا دیدیا

ٹنڈن جی کے اس طرز عمل کو بعض لوگ ان کے ایثار سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے کانگریس کی صدارت نہ چھوڑی تو جواہر لال ورکنگ کمیٹی سے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس واقعہ کا کانگریس کے اقتدار پر اتنا خراب اثر پڑے گا کہ آیندہ انتخاب میں مشکل ہی سے وہ یا کانگریس کا کوئی ممبر کامیاب ہو سکے گا

اس کو کانگریس کا ہر ہر فرد اچھی طرح جانتا ہے کہ جس حد تک عوام کا تعلق ہے وہ کانگریس اور جواہر لال نہرو میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور کانگریس کی جو کچھ ساکھ باقی ہے وہ صرف نہرو کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس لئے آیندہ انتخاب میں کانگریس کے کسی ممبر کا کامیاب ہو جانا اس حال میں کہ نہرو کی دلچسپی کانگریس سے ختم ہو چکی ہو ان کے نزدیک بھی ممکن نہ تھا۔ اور اسی لئے کانگریسیوں نے ٹنڈن جی کے استعفے اور ورکنگ کمیٹی کی نئی تعمیر و تشکیل کے تلخ گھونٹ کو برداشت کر لیا

نہرو کے صدر کانگریس ہونے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ آیا وہ لوگ جو کانگریس کو چھوڑ چکے ہیں، پھر کانگریس میں شامل ہوں گے یا نہیں اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے رفیع احمد قدوائی اور کرپلانی کی طرف لوگوں کی نگاہیں اُٹھیں، چنانچہ حالات بتاتے ہیں کہ قدوائی تو غالباً جلد واپس آجائیں گے اور کرپلانی بھی غور و تامل کے بعد یہی راہ اختیار کریں گے، کیونکہ نہرو کے صدر کانگریس ہو جانے کے بعد پرجا پارٹی کی اہمیت تقریباً ختم ہو چکی ہے اور کرپلانی جی کو اپنے بمبئی کے دورہ میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پرجا پارٹی کو پبلک کی ہمدردی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ اب وہ کوئی نئی چیز ایسی پیش نہیں کر سکتی جو کانگریس کے مقاصد سے مختلف ہو۔ اور اس لئے وہ لوگ جن سے ہمدردی و اعانت کی توقع کی جاتی تھی وہ اگر کانگریس کی طرف نہ گئے تو سوشلسٹ جماعت میں شامل ہو جائیں گے

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نہرو کی صدارت کانگریس اور رفیع احمد قدوائی یا دوسرے منحرف ہو جانے والے ارکان کی واپسی سے یہ کتھی ہمیشہ کے لئے سلجھ جائیگی اور کانگریس حکومتوں کی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ہمیں اس میں شبہ ہے

اس سلسلہ میں رفیع احمد قدوائی کا یہ بیان بہت معنی خیز ہے کہ جب تک کانگریس حکومت کے ارکان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہو اور عملی حیثیت سے ان خرابیوں کا ازالہ نہ کیا جائے جنھوں نے کانگریس کو بدنام کر دیا ہے، محض صدارت کی تبدیلی یا ورکنگ کمیٹی کی جدید تشکیل مفید نہیں ہو سکتی

قدوائی صاحب کا یہ بیان کھلا ہوا اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ خرابیوں کا اصل تعلق صوبائی حکومتوں سے ہے اور جب تک ان میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے کوئی مفید نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل وہی چیز ہے جس کا ذکر نہرو جی نے بھی اپنی سالگرہ کی تقریر میں کیا ہے۔ انھوں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ کانگرس پارٹی بازی کا شکار ہو گئی ہے اور ہماری طاقتیں غلط راستے پر استعمال ہو رہی ہیں۔ ہمیں پارٹی بازی کی لعنت کو ختم کرنا ہوگا،

اور اسی کے ساتھ دوسری خرابیوں کو بھی جو کانگریس کو کمزور کر رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام کانگریس کمیٹیاں از سر نو اپنی تنظیم کریں تاکہ پارٹی بازی اور خویش پروری، ختم ہو جائے۔ جو لوگ انصاف سے کام نہیں کر سکتے انھیں ذمہ دار عہدوں سے ہٹا دینا چاہئے اور آئندہ انتخاب میں صرف انھیں امیدواروں کو نامزد کرنا چاہئے جن کے متعلق یقین ہے کہ وہ پوری دیانت و امانت کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیں گے اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیتوں کے نمایندوں کو جو کانگریس اصول کے حامی ہیں انتخاب کے لئے نامزد کیا جائے

ہمارے وزیر اعظم نے وہ سب کچھ کہدیا ہے جو موجودہ حالات میں کانگریس کی اصلاح کے لئے کہنا چاہئے تھا، لیکن ان کو کچھ اور تفصیل میں جاکر یہ بھی صاف صاف کہدینا چاہئے تھا کہ کانگریس کمیٹیاں ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہیں جو صرف جیل جانے کی سند اپنے پاس رکھتے ہیں اور کوئی تنظیمی اہلیت یا اخلاقی بلندی نہیں رکھتے۔ خصوصیت کے ساتھ ملازمتوں میں تو کانگرسی وغیر کانگرسی کو بھی نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ صرف کام کی اہلیت، کیرکٹر کی مضبوطی، انتظامی قابلیت، اور دیانتداری کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ پچھلے چار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ وہی لوگ ناکارہ ثابت ہوئے جن پر محض کانگرسی ہونے کی وجہ سے اور صرف اس استحقاق پر کہ وہ ایک یا دو مرتبہ جیل جا چکے ہیں، بھروسہ کیا گیا تھا

یہ وقت جواہر لال نہرو کے لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا ہے اور ان کی ذرا سی غلطی یا رعایت سخت تباہ کن ثابت ہوگی۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے (اور ان سے زیادہ کون اس حقیقت کو جان سکتا ہے) کہ ٹنڈن جی کا استعفا اور ٹنڈن جی کے ساتھیوں کا خاموشی کے ساتھ ان کی صدارت کانگریس کو قبول کر لینا اس لئے نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنی رجعت پسندی کو ترک کر چکے ہیں یا صداقت کے ساتھ کانگریس کی تنظیم و اصلاح چاہتے ہیں بلکہ انکا مقصود صرف یہ ہے کہ وہ جواہر لال نہرو کی وساطت سے انتخاب میں کامیابی حاصل کر سکیں (جو بصورت دیگر ممکن نہیں)۔ اور جب وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر زیادہ قوت کے ساتھ مخالفت کریں

الغرض جواہر لال نہرو کو اس وقت ان برادرانِ یوسف سے ہوشیار رہنے کی سخت ضرورت ہے اور انھیں چاہئے کہ سب سے پہلے وہ صوبوں کی کانگریس کمیٹیوں کو گندہ عناصر سے پاک کرائیں اور پھر اس بات کی کوشش کریں کہ کانگریس ٹکٹ پر وہی شخص انتخاب کے لئے کھڑا ہو جس کا کیرکٹر بیداغ ہے۔ ہم یہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے ہیں جو نہرو کے سامنے نہ ہو، لیکن ہم کو جس بات سے ڈر لگتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ نہایت سچے جذباتی قسم کے انسان ہیں اور ایسا انسان ہمیشہ ظاہری تملق اور تعلقات دیرینہ کے خیال سے متاثر ہو جایا کرتا ہے

پچھلے چار سال کے تجربہ نے جواہر لال نہرو کو اچھی طرح بتا دیا ہوگا کہ ملک کا دوست کون ہے اور دشمن کون، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس وقت کتنے سانپ تھے جو انھوں نے اپنی آستین میں پال رکھے تھے، اس لئے آیندہ انتخاب ان کے لئے آخری موقعہ ہے کہ وہ اپنے ان تجربات سے فایدہ اٹھائیں اور صحیح معنے میں ہندوستان کو ایک لامذہبی جمہوریت بننے کا موقعہ دیں۔

اس وقت جواہر لال نہرو کے مخالفین میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت مہراجی کی ہے، جو نہرو کو ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کر کے لوگوں کو نہرو کی ڈکٹیٹرشپ کا یقین دلا رہے ہیں... مہراجی دراصل راشٹریا سیوک سنگھ کے عملی مجاہدین میں سے ہیں، اسلئے ان کا یہ طرز عمل خلاف توقع نہیں، لیکن خطرناک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خالص کانگرسی کہتے ہیں، اور کانگرسی ہونے ہی کی حیثیت سے وہ نہرو اور نہرو حکومت پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے لوگ ان کے ظاہر و باطن میں تمیز نہ کر کے دھوکہ میں آجائیں۔ ایک بہت بڑی گتھی مشرقی پنجاب کی بھی ہے، جہاں زبردست اکثریت سہارگوا پارٹی کی ہے۔ اگر اس کو کانگرس ٹکٹ پر مقابلہ کرنے کا موقعہ مل گیا تو نتیجہ وہی ہوگا جو اس سے قبل ظاہر ہو چکا ہے اور اگر کانگرس کے خلاف ہو کر اس نے الکشن میں حصہ لیا تو کانگرس کو کامیابی کی وہاں بہت کم امید ہے۔ بہرحال نہرو اس وقت ایک بڑی کٹھن منزل سے گزر رہے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس منزل سے کامیاب گزرنے میں، ہر حیثیت سے ان کا ساتھ دیں۔

ایک غلطی کی تصحیح

ستمبر کے نگار میں "صدائے شکست" کے عنوان سے جو نظم شایع ہوئی ہے وہ علامہ جمیل مظہری کی ہے، غلطی سے نظیر صدیقی کا نام درج ہو گیا۔ منیجر نگار

وسط ایشیا کی کلچری ترقی

وسط ایشیا کا علاقہ پہلے توران کہلاتا تھا، پھر روسی ترکستان کہلایا اور آج اس کا نام سوویٹ مشرق ہے۔ یہ علاقہ افغانستان و ایران کے شمالی میں چینی ترکستان سے لیکر بحر قزوین (کاسپیان) تک پھیلا ہوا ہے اور کازکستان، ازبکستان، تاجکستان، ازبکستان اور ترکمانستان کی پانچ آزاد و خود مختار جمہوریتوں پر مشتمل ہے جو سوویٹ وفاق میں شامل ہیں

چودھویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور علم و فن کا تنہا مرکز تھا۔ فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی، ایک تاجیک تھا فردوسی بھی تاجیک، نژاد تھا، بوعلی سینا بخارا میں پیدا ہوا، مشہور عالم البیرونی خیوا کا باشندہ تھا۔ اسلامی تاریخ نے جو تین مدبرین سلطنت پیدا کئے ان میں جعفر برمکی اور نظام الملک طوسی کے علاوہ تیسرا ملا علی شیر نوائی بھی ازبک تھا اور خراسانی کی تیموری حکومت میں سلطان حسین کا وزیر و مشیر تھا۔ خوارزم کی سلجوقی حکومت اسی علاقہ میں سرسبز ہوئی اور نظام الملک کا جوہر کمال بھی اسی سرزمین پر چمکا

خانوادۂ تیمور کے سائنسداں شہزادے رفیع بیگ نے سمرقند کی رصدگاہ میں بیٹھ کر فلکیات کے جو اصول وضع کئے وہ بیسویں صدی کے ماہرین ہیئت کے لئے بھی وجہ حیرت بنے ہوئے ہیں، الغ بیگ نے اپنی رصدگاہ کی جو عمارت بنوائی تھی، اس وقت کی دنیا میں اس عمارت کا ثانی قسطنطنیہ کی آیا صوفیا کے علاوہ دوسری عمارت نہ تھی

حافظ و خیام اور سعدی جتنے ایرانی تھے اتنے ہی تورانی بھی تھے۔ بلبل شیراز کو اپنے محبوب کے "خال ہندو" کے سامنے جب تحفہ پیش کرنا تھا تو اس کی نگہ انتخاب پر ایران کے اصفہان و شیراز نہیں چڑھے بلکہ توران کے سمرقند و بخارا ہی اس قابل نظر آئے۔ وسط ایشیا کی عظمت اور اس کے قدیم کلچر پر حافظ کا یہ شعر دلیل ہے

بلاشبہ اس زمانہ میں وسط ایشیا کی یہ مسلم قومیں تہذیب و تمدن کا مرکز تھیں اور دنیا کو علم و فن کی روشنی پہونچا رہی تھیں، کون نہیں جانتا کہ تیموری و سلجوقی دربار علمی و کلچری ترقیوں کے لحاظ سے مشعل ہدایت تھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ خوارزم و خراسان اور سمرقند و بخارا ساری دنیا میں عروس البلاد کی حیثیت سے مشہور و معروف تھے

امتداد وقت نے اس پورے علاقے کو زار روس کی نوآبادی بنا دیا، سارا ملک امیروں اور خانوادوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا، اور یہ حکومتیں زار شاہی زمانہ میں رجواڑے بن کر رہ گئیں۔ باہر کی دنیا میں امیر بخارا اور خان خیوہ کی ریاستوں کو تو لوگوں نے جانا، باقیوں کو تو کسی نے پہچانا تک نہیں

سامنتی نظام کی بدولت اور قومی حکمرانوں کی رجعت پرستی کے طفیل اس علاقہ کی یہ مختلف قومیں اقتصادی بدحالی کے گڑھے میں گر گئیں اور صدیوں تک کلچری تنزل میں مبتلا رہیں۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے وقت یہ تمام قومیں غلاظت و جہالت کے پاتال میں پہونچ چکی تھیں، جسم و جان میں علاقہ قایم رکھنا اتنا دشوار ہو گیا تھا کہ یہاں کے لوگ کسی دوسری طرف دھیان دے ہی نہ سکتے تھے۔ انقلاب کے وقت ان مختلف علاقوں کا تعلیمی اوسط ڈھائی فی صدی سے زیادہ نہ تھا۔ اس اوسط میں سے اگر امرا و عمال حکومت اور ملاؤں کو نکال دیجئے تو عوام سو فیصدی جاہل تھے

اقتصادی بدحالی، سیاسی بے بسی اور قومی حکومت کی فرض ناشناسی اس ایک مثال سے روشن ہو جاتی ہے کہ امیر عالم اللہ خاں نے اپنے چوبیس سال کی حکمرانی میں اور پونے دو کروڑ روبل سالانہ کی آمدنی میں سے ایک مسجد، ایک مدرسہ اور ایک پل بنوا کر ہمیشہ فخر و ناز کیا۔ دوسری مثال یہ ہے کہ

قلت کی بنا پر پانی دولت میں بدل گیا تھا جس پر تونگروں اور زمینداروں کا قبضہ تھا، اسی طرح جس طرح وہ زمینوں کے مالک بن گئے تھے۔ دولت مند لوگ پانی کے ذخیرے بیٹیوں کے جہیز میں دینے لگے تھے

وسط ایشیا میں آج جو کلچری عمل یا ترقی ہو رہی ہے اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زار شاہی زمانہ کی تاریخ بھی نظر میں ہو۔ روس کی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں کانگریس نے ۱۹۲۱ء میں ایک ریزولیوشن پاس کیا تھا جس سے ماضی قریب میں وسط ایشیا کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ریزولیوشن یہ تھا:۔ "زار شاہی میں روس کے دور افتادہ علاقے، خاص کر ترکستان، نوآبادی کی حیثیت رکھتے تھے، اور اس لئے زندہ و باقی رکھے جاتے تھے کہ وہاں سے روسی کارخانوں کے لئے خام پیداوار جبراً حاصل کی جائے"

"ان پست ملکوں کی آبادی کے ترقی نہ کر سکنے کی اصل وجہ یہ پالیسی تھی؟ اور یہی سبب ہے کہ ان علاقوں میں صنعتی طبقہ پیدا نہ ہو سکا....."

اس ریزولیوشن کے ان تھوڑے سے لفظوں میں وسط ایشیا کے عوام کی حالت کا پورا مرقع نظر آ جاتا ہے۔ روسی ترکستان کے مسلم عوام کو تعلیم و تعلم کی بس اتنی اجازت تھی کہ وہ عیسائی مشنریوں کے رسالے پڑھ سکیں، پادریوں کے وعظ سن لیں اور روسی قومیت کا پروپیگنڈا قبول کر لیں، لیکن سوویٹ یونین قایم ہونے پر جو لیس ایسی قومیں منظر عام پر آ گئیں جن کی کوئی تحریری زبان نہ تھی، یعنی جو الفاظ بول لیتے تھے مگر لکھنے کے لئے حروف تہجی نہ رکھتے تھے

تہذیب و تمدن کے بام ترقی پر پہونچنے کے بعد ذلت و ادبار کے ایسے گڑھے میں گر جانے کی جو مثال وسط ایشیا پیش کرتا ہے، شاید دنیا کا کوئی حصہ پیش نہیں کر سکتا

مگر اسی کے ساتھ ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ بھی تھی کہ وسط ایشیا کے یہ عوام ہر چند علم و ہنر سے محروم کر دئے گئے تھے لیکن انھوں نے (اور شاید غیر شعوری طور پر) اپنی پرانی کلچری روایات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ کلاسکی فارسی شاعری کسی نہ کسی صورت میں اور کسی نہ کسی حد تک ان لوگوں کی زندگی میں داخل رہی اور چونکہ وسطی مشرق کا قدیم کلچر ایران و توران کے علاوہ افغانستان و قفقاز وغیرہ میں بھی مشترک تھا اس لئے یہ شہادت ملتی ہے کہ نظامی گنجوی کے کردار ترکمانیہ کے لوک گیتوں اور کہانیوں میں آج بھی زندہ ہیں

لوک گیت پرانے کلچر کو یاد رکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان قوموں میں بے پڑھے لکھے شاعر پیدا ہوتے رہے (ہندوستان میں ایسے شاعروں کی مثال بھاٹ ہیں)۔ یہ بے پڑھے لکھے شاعر بالعموم بدیہہ گو ہوتے تھے، اور ان کی شاعری کبھی بے لکھی رہتی تھی۔ ان کے کلام کی اشاعت کا طریقہ یہ تھا کہ وہ دیہاتوں میں گھومتے اور داستانیں سناتے پھرتے تھے۔ یہی ان کی معاش کا ذریعہ بھی تھا۔ ایسے شاعروں کا موضوع کلام قومی روایات تھیں اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں قومی کردار اور ان کی سورماؤں کے کارناموں کو نئی زندگی مل جاتی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی شاعری بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی اور اس ادارے کی اہمیت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ زار کی نوآبادیاتی پالیسی کا مقصد ان قوموں کو متحد نہ ہونے دینا اور آپس میں برسر عناد رکھنا تھا۔ یہ پالیسی سامراج کا چلتا ہوا داؤں ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ کامیابی کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے

زار کے ان علاقوں میں تعلیمی پالیسی کا منشاء یہ تھا کہ قومی اور مقامی زبانوں میں تعلیم نہیں دی جاتی تھی اور جہاں اور جتنی بھی تعلیم دی جاتی تھی وہ صرف روسی زبان میں دی جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان قوموں کے مابین کلچری رشتہ قایم رہا اور ایک قوم کا ادب و کلچر (لوک گیت) دوسری قوم کو متاثر کرتے رہے۔ تاتار کی شاعری نے ترکمانیہ کے لوگوں پر اثر ڈالا، تاجیک ادب ترکمانیہ اور ازبکستان کو متاثر کرتا رہا، اور فارسی کی ہمزبانی کی وجہ سے تمام ترکستانی قوموں کا ادب ماوائے قفقاز بھی دخیل رہا اور اس طرح جو کلچری اثر ایک قوم سے دوسری قوم میں پہونچا تو ان مہاجر خیالات و تصورات کے اندر سے دوسرے خیال اور تصور پیدا ہوتے رہے، جو قصے کہانیاں کسی علاقے میں پہونچتیں تو ان سے نئی حکایتیں اور قصے وضع ہو جاتے تھے۔ یہ کہانیاں بالعموم غایت و مقصد کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ شکل و صورت میں بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوتی تھیں۔ مثلاً عاجی نصیر الدین کا کردار قفقاز کے ترکی بولنے والے علاقہ میں پیدا ہوا مگر ازبکستان میں افاردی (یا افریدی) بن گیا، ترکمانیہ میں الدکوش اور کریمیا کے تاتاروں میں اغنبا باشی احمد بیگ

کہلایا (روس خاص کے ادب میں بھی حاجی نصیر الدین کے کردار نے کئی ادب پارے پیدا کرادئے اور قبل انقلاب کا روسی ادب بھی ان مختلف محکوم قوموں کے ادبی اثرات سے دامن نہ بچا سکا تھا۔ چنانچہ ٹالسٹائی کے فسانوں میں کازاک اور حاجی مراد مشہور کردار ہیں)

ترکمانیہ کے کلاسکی ادب کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں، لیکن اس کا بے لکھا ادب (لوک گیت اور ساکھے) اتنا ہی پرانا ہے جتنا ازبکستان کا معیاری ادب ہے۔ سوویٹ حکومت قایم ہونے کے وقت ترکمانیہ کے کلاسکی شاعر مخدوم قلی کی رزمیہ داستانیں ترکمان قوم کے دلوں میں وطنیت اور جانبازی کے جذبہ کو ابھار رہی تھیں اور ایک ایک ترکمان اس جذبہ سے معمور تھا۔ مخدوم قلی کے بعد اس کا بھانجا جلیلی مقبول اور محبوب عوام ہوکر اپنی قوم کا "لاڈلا مطرب" بنا۔ وردی قلیچ نہایت ہی مقبول شاعر ہے۔ یہ پیدائشی اندھا ہے یہ ایک بے (زمیندار) کے کھیت پر مزدوری کرتا تھا وردی کو بچپن ہی سے گانا سننے کا شوق اور حافظہ بلا کا تھا۔ جو گیت سنا یاد ہوگیا۔ اس طرح وہ خود بھی گانے لگا۔ "گاتے گاتے کلاونت ہو جاتا ہے" ہماری زبان میں ایک کہاوت ہے جو وردی پر پوری طرح سچی اترتی ہے۔ پھر وہ گیت جوڑنے لگا اور اپنی جوانی ہی میں قوم کا محبوب شاعر بن گیا

وردی کی غرامی شاعری میں وسط ایشیا کے فن وصناعت کی تمام روایات محفوظ اور زندہ ہیں، لیکن اس نے ایک بدعت بھی کی ہے اور وہ یہ کہ جب وہ کوئی نظم سنانے لگتا ہے تو پہلے ایک حکایت بیان کرتا ہے، یہ حکایت گویا اس نظم کا دیباچہ ہوتی ہے جس میں اس کی وجہ تسمیہ، شان نزول اور اخلاقی نتیجہ ہوتا ہے

وردی نے جو زمانہ دیکھا اور جن حالات سے دوچار ہوا وہ ایسے سنگین و جانکاہ واقعات تھے جن کے سامنے بڑے بڑے مرد بھی قایم نہ رہ سکتے تھے، مگر وردی کے قدم کو لغزش نہیں ہوئی۔ اس نے دیہات کے افلاس اور جہالت کے اندھیرے میں آنکھیں کھولیں، شدائد و مصائب برداشت کئے مگر اس کے مزاج و فطرت پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وردی نے ان حالات کو ستم ظریفی سمجھا اور اسی طرح برتا بھی۔ اس کی عمر بھر کی شاعری میں کبھی ایک موقع پر بھی شکست کا احساس یا ناامیدی کا اظہار نہیں ملتا۔ وہ حقیقتاً رجائی مسلک کا آدمی ہے۔ شاعر سلیمان وفراح کی طرح اس کے کلام کی خصوصیت بھی طنز و مزاح ہے

انیسویں صدی میں ازبکستان میں بھی ترکمانیہ کی طرح تین بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ مقیمی، بعاش اور محمد دق، اور عجیب اتفاق تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے زمانے میں دربار داری اور اس کی قصیدہ خوانی سے متنفر اور باغی رہا۔ درباری شعراء کے برخلاف ان تینوں نے محبان ملک و فدایان وطن کے گیت گائے یا پھر سامنے آقاؤں کی ہوس کاریوں اور سفاکیوں کا پردہ چاک کیا

دنیا کے عوام الناس نے تاریخ کے ہر دور میں ظالم اور سفاک حکمرانوں اور آقاؤں سے نفرت کی ہے، ازبکستان کے عوام ان شاعروں کے طنز و مزاح کے اندر ظلم رانوں سے اپنی نفرت پہچان کر ان شعراء سے محبت کرتے رہے تھے۔ جینوا و خوقند کے خان اور امیر اور نوکر کے گماشتے ان ترقی پسند شاعروں پر جبر و تشدد کرتے تھے مگر کبھی بھی ان کی آواز کو خاموش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے

ازبکستان میں صدر الدین عینی[1] کو لسان القوم الادلون کا مرتبہ حاصل ہے اور وہ ایک نہایت مقتدر و محترم شاعر و ادیب ہے۔ جب انقلاب آیا تو عینی کی استادی مسلم ہو چکی تھی۔ شروع ہی سے عینی نے ترقی پسندی کو اپنا مسلک بنایا اور رجعتی طاقتوں کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا۔ اپنے عقیدے کی قیمت اس نے سزا و عقوبت اٹھا کر ادا کی اور جس وقت انقلاب شروع ہوا تو عینی آگے کی صف میں نظر آیا

وسط ایشیا میں انقلاب کے اثرات

ایشیا میں سوویٹ قوموں کی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انقلابی دور کے حالات مختصراً بیان کر دئے جائیں۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں انقلاب کامیاب ہوا تو روسی حکومت نے تمام محکوم قوموں کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس لئے ہر قوم کو اپنے قومی مستبد حکمرانوں کے خلاف بھی بغاوت کرنا پڑی۔ اور جب ان تمام علاقوں میں خان اور امیر معزول و برطرف کر دئے گئے، جب ان صدیوں سے مقید علاقے پر آزادی کا سورج چمکا تو ترکستان میں اس کی سو فیصدی مسلم آبادی کے اندر نسلی

---

[1] عینی پر ایک مفصل مضمون جداگانہ شایع ہوگا۔ ل۔ احمد

اعتبار سے پانچ مختلف قومیں رونما ہو کر پانچ جمہوریتیں وجود میں آگئیں۔ روس کی وفاقی جمہوریت نے ان نئی جمہوریتوں کو برادرانہ اور ہمدردانہ امداد دی اس بے لوث انسانی سلوک کا پہلا اخلاقی نتیجہ یہ نکلا کہ کہاں تو زار شاہی سلوک کی بدولت یہ تمام قومیں روسیوں سے نفرت کرتی تھیں، اب وہ ان سے برادرانہ محبت کرنے لگیں اور باہمی رواداری اور بھائی چارہ کا رشتہ قایم ہو گیا۔ اسی اخوت اور مساوات کے برتاؤ کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۲۲ء میں یہ سب اور دوسری قومیں بھی بہ رضا و رغبت سوویٹ وفاق میں شامل ہو گئیں۔ یہ تعلقات آج تک قایم ہیں اور مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا ایک بڑا ثبوت تو دوسری جنگ عظیم میں سوویٹ روس کی بے مثال فتحمندی ہے اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ عین حالتِ جنگ میں سوویٹ حکومت نے اپنی وفاقی جمہوریتوں کو اس بات کا مجاز کر دیا کہ وہ اپنی مخصوص قومی فوجیں بنائیں اور دنیا کی طاقتوں سے براہ راست سیاسی تعلقات قایم کریں۔ لیکن آج تک کسی وفاقی جمہوریت نے اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ دوران جنگ میں ہٹلری جرمنی نے انتہائی کوشش کر لی کہ پرانے قوم پرست یوکرینیوں اور بیلورشین میں کوئی تو ایسا مل جائے جسے ان فتحمند علاقوں میں حکومتوں کا سربراہ بنایا جا سکے۔ بین الملی بھائی چارے کا اس سے برتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟

سڈنی اور بیٹرس ویب کی ہستیاں عالم میں مشہور و معروف ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے سوویٹ روس کے کئی سفر کئے اور وہاں کے حالات پر کئی کتابیں لکھیں جو مطالعہ کی حیثیت سے غیر جانبدارانہ سند کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام "اشتراکی تہذیب" ہے۔ یہ دو لفظی جملہ اہم معنی کا حامل ہے، اشتراکی نظام سماجی یا طبقاتی فرق و اختلاف ہی کو نہیں مٹاتا بلکہ رنگ و نسل کا امتیاز، آقا و غلام، اشراف و اجلاف، کالے اور گورے کا فرق ختم کر کے ایک نئے تمدن یا کلچر کو جنم دیتا ہے

اشتراکی تعمیر کے لئے لازم تھا کہ سماجی اور نسلی تقسیموں کو ختم کر کے کلچری اونچ نیچ کو بھی باقی نہ رکھا جائے۔ کوئی قوم دوسری قوم سے کلچر یا تہذیب میں بھی پیچھے نہ رہنے پائے۔ سوویٹ آئین میں رنگ و نسل کا فرق کرنا جرم قرار دیا گیا ہے اور قانون پر عمل درآمد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت خود اشتالین کی ذات ہے جو ایک چھوٹی سی قوم جارجین کا ایک فرد اور ایشیائی ہونے کے باوجود پچاسوں کالی گوری قوموں کا، عیسائی، یہودی اور مسلم مذہبوں کے ماننے والوں کا محبوب رہبر اعظم بنا ہوا ہے

یہ سوچنا اور اس پر عمل کر کے دکھا دینا کہ پست قومیں ترقی کر کے ترقی یافتہ قوموں کے برابر ہو جائیں، اشتالین کے دماغ کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ پنج سالہ صنعتی پروگراموں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جو علاقے زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں وہاں کے لئے بجٹ میں زیادہ روپیہ رکھا جاتا ہے۔ پست قوموں کو ترقی یافتہ قوموں کے ہمدوش کر دینے کی یہ پالیسی بہت زیادہ حد تک کامیاب ہو چکی ہے

اس ذکر میں نوجوان ازبک ادیب، سلطانوف کے ڈراما "پرواز شاہین" کا حوالہ بے موقعہ نہ ہوگا۔ FRUNZ ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں روسی کمیونسٹ پارٹی کا نہایت ہردل عزیز لیڈر تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے سرخ فوج کے ناظم و جرنیل کی حیثیت سے انقلاب کے باغیوں کی سرکوبی کر دی۔ سلطانوف کے اس ڈرامہ کا ہیرو یہی فرنز ہے اور مصنف نے ڈرامہ میں وہ واقعات پیش کئے ہیں جو ڈراما دیکھنے والوں یا ان کے باپ اور بھائیوں کو پیش آئے تھے اس ڈرامے میں ایک منظر یہ بھی ہے کہ جرنیل فرنز ایک سپاہی کو جس کا نام عمر ہے افسر بنا دیتا ہے۔ وہ سرخ سپاہی اپنے آپ کو افسری کے قابل نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ "میں ایک بے پڑھا لکھا ازبک ہوں!" اس پر جرنیل فرنز اس سپاہی کو یہ حکایت سناتا ہے کہ "شاہین کچہ شروع میں اڑنے سے ڈرتا ہے، اسکی ماں اپنے بچے کو پہاڑ کی بلندی پر سے ڈھکیل دیتی اور ساتھ ساتھ اڑتی رہتی ہے۔ اسی طرح روسی قوم اپنے پچھڑے ہوئے بھائیوں کو اڑنا سکھائے گی"

سوویٹ نظام کی یہ وہ پالیسی ہے جس نے بہت چھوٹی قوموں میں بھی نہایت اونچے درجے کے شاعر و فنکار پیدا کر دئے۔ LAZGINIA کی قوم تعداد میں کل پچیس ہزار ہے۔ سلیمان اسٹالسکی اس قوم کا ایک نامور شاعر ہے جسے گورکی نے بیسویں صدی کا ہومر کہا ہے اور جس کی نظمیں نہ صرف ساری سوویٹ قوموں میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں بلکہ اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ سلیمان کی نظموں کا ترجمہ گورکی نے خود کیا اور اسے دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ گورکی نے جب یہ کہا کہ "ادب کی قدر مقدار نہیں بلکہ وصف و کمال کی بنا پر ہوتی ہے" تو گورکی کے ذہن میں سلیمان کی شاعری تھی

سوویٹ قوموں کے بچے [illegible] کے ثبوت میں [illegible] شہادت اور دینا چاہتا ہوں۔ اخبار پڑھنے والے ہندوستانی جانتے ہونگے

کہ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں جرمن فوجیں روس کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہوگئی تھیں۔ بہت سی آبادیاں تباہ و برباد ہوئیں اور ان کے باشندے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے تھے۔ لاکھوں بچے یتیم و خانماں برباد ہوگئے تھے۔ سوویٹ نظام قوم کے بچوں کو سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے۔ یوکرین اور بیلوروس کے ہزاروں سفید عیسائی بچے سوویٹ مشرق کے مسلمانوں کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ ہر گھر میں ایک بچہ کو گود لینا رواج پا جاتا ہے۔ جس دفتر سے بچے تقسیم کئے جاتے ہیں وہاں ایک عورت آتی اور اپنا حصہ مانگتی ہے۔ جواب ملتا ہے کہ بچے سب تقسیم ہوگئے۔ وہ عورت سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے کہ اب وہ اپنے شوہر کو کیا جواب دے گی جو کئی روز سے تقاضا کر رہا تھا کہ وہ جا کر ایک بچہ لے آئے۔ اس کا گھر نکو بنے گا۔ سارے گھروں میں بچے ہوں گے اور ان کا گھر شرمندہ و ذلیل ہوگا۔ عورت کی بدحالی کو دیکھ کر دفتر والے اسے یقین دلاتے ہیں کہ اب جو بچے آئیں تو سب سے پہلے اسے ایک "سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی" دیجائے گی۔ معلوم رہنا چاہئے کہ یہ عورت خود بھی نو بچوں کی ماں تھی

دوران جنگ میں ایک مصنف کا فسانہ شایع ہوکر بے حد مقبول ہوا جس کا عنوان ہی "قومی بھائی چارہ" تھا۔ اس فسانے میں تین ٹینکچیوں کا قصہ ہے جو ایک ہی ٹینک پر مامور تھے۔ یہ تینوں تین مختلف قوموں کے فرد تھے۔ مگر جب ڈیوٹی پر نہ ہوتے تب بھی ہر وقت اور ہر جگہ دیکھے جاتے تھے اور اس بنا پر ان کے ٹینک کا نام ہی "قومی بھائی چارہ" پڑ گیا تھا۔ اس لئے کہ انسانی محبت و رفاقت کی جو مثال ان تینوں کے عمل سے ملتی تھی وہی سوویٹ "قومی پالیسی" تھی

ان دو ایک مثالوں سے اس پالیسی کی اہمیت کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے

تعلیمی و کلچری ترقی

زار شاہی عہد میں یورپی روس کا علاقہ اور اس کی شہری آبادی تعلیم اور کلچر سے روشناس تھی۔ اس زمانے کا پورے ملک کا تعلیمی اوسط بائیس فیصدی تھا۔ لیکن سوویٹ حکومت کے اٹھارہ برسوں میں یہ اوسط بانوے فیصدی تک جا پہونچا تھا۔ نیچے دئے ہوئے اعداد و شمار کسی تفصیل کے محتاج نہیں ہیں :-

۱۹۱۳ء میں	ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں جملہ طلباء کی تعداد	اٹھتر لاکھ تھی
۱۹۲۷ء میں	"	ایک کروڑ بارہ لاکھ ہوئی
۱۹۳۶ء میں	"	دو کروڑ اناسی لاکھ ہوگئی
۱۹۱۵ء میں	اعلیٰ تعلیم گاہوں میں طلباء کی جملہ تعداد	اڑتالیس ہزار تھی
۱۹۳۱ء میں	"	پانچ لاکھ تین ہزار ہوئی
۱۹۳۶ء میں	"	سات لاکھ اٹھتر ہزار ہوگئی

۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۵ء میں طلباء کی اس تعداد پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ زار شاہی عہد میں کتابوں کی اشاعت کا اوسط محض اعشاریہ سات تھا جو سوویٹ عہد میں بڑھ کر چار اعشاریہ ایک یعنے چھ گنا ہوگیا۔ یہ اطلاع کم دلچسپ نہ ہونا چاہئے کہ سوویٹ روس میں کتاب لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہے جو دنیا کے بہت زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی نہیں ہوتا اور ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کتاب شایع ہونے کے دو گھنٹے بعد بازار میں نہیں ملی ہے

اس ذیل میں کازکستان کی مثال کے پیش نظر باقی علاقوں کے متعلق قیاس قایم کیا جا سکے گا۔ انقلاب سے پہلے یہ علاقہ خانہ بدوشوں کا ملک تھا پچھلی چھے صدیوں میں کازکستان کے اندر جتنا ادب وجود میں آیا، سوویٹ عہد کے پندرہ برسوں میں اس سے پندرہ گنا ادب پیدا ہوگیا

یہ اعداد و شمار ۱۹۳۶ء تک کے ہیں۔ اس کے بعد کے برسوں میں، جنگ کے چار سال چھوڑ کر، ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز رہی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں بہت بڑی تباہی و بربادی ہوئی مگر جنگ کے پنج سالہ پروگرام میں تعمیر و ترقی بھی بہت زیادہ ہوئی ہے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک کا پنج سالہ پروگرام چار ہی سال میں مکمل ہوگیا اور سوویٹ روس میں بعض چیزوں کی پیداوار بڑے سے بڑی پیداوار کرنے والے ملکوں کے برابر پہونچ گئی ہے

وسط ایشیا کی بعض قوموں کے پاس کسی قسم کا کلاسکی ادب نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ لوک گیتوں اور ساکھوں کی شکل میں تھا۔ یہ عام تجربے کی بات

ہے کہ آدمی کی ایک حس ناقص ہو جاتی ہے تو کوئی دوسری حس زیادہ سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے، چنانچہ ان قوموں میں تعلیم مطلق نہ تھی مگر ذہن و حافظہ غیر معمولی تھا۔ وسط ایشیا کی یونیورسٹی خاص کر اس کے شعبۂ لسانیات اور ان علاقوں کے ٹیچروں کے انسٹی ٹیوٹ نے پنج سالہ پروگراموں کی تکمیل میں زبردست کام کیا۔ نئی نسل اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے شعر و ادب اور تنقید و صحافت کے میدان میں آگئی، اور ان نوجوان اہل قلم میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو دیہات کے رہنے والے تھے اور جو آج نامور شاعر و ادیب ہیں۔ آج چھوٹی سے چھوٹی سوویٹ قوم ایسی نہیں جس کی اپنی قومی زبان اپنا قومی ادب، اپنا قومی تھیٹر اور اپنا قومی پریس نہ ہو

سوویٹ قوموں کی کلچری ترقی کے اور اشتراکی کلچر کے ذکر میں اسٹالین کی ایک تقریر کے یہ فقرے خاص اہمیت رکھتے ہیں:۔

"..... انقلاب نے ملک کے اندر زبانوں کی تعداد کو گھٹایا نہیں بلکہ بڑھا دیا ہے اور فی الحقیقت انقلاب ایک ایسی چیز ہے جو دریائے انسانیت کی تہ میں بھی موجیں دوڑا دیتا ہے۔ انقلاب نے بہت سی چھوٹی قوموں کو ابھار کر سیاست کی بساط پر لا کھڑا کیا ہے، انھیں نئی زندگی دیکر ترقی کے راستے پر ڈال دیا ہے"

اسٹالین نے یہ تقریر ۱۹۲۵ء میں کی تھی۔ مگر اس کے بعد سچ مچ چھوٹی موٹی ایسی پچاس قومیں سامنے آگئیں، پہلے جن کے وجود کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا۔ آج یہ سب قومیں سوویٹ یونین کے اندر خود مختار جمہوریتوں کی حیثیت سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان قوموں میں ایسی بھی تھیں جن کی کوئی تحریری زبان نہ تھی۔ چنانچہ ایسی قوموں کے لئے ان کی بولیوں کی مناسبت سے حرف ہجا وضع کئے گئے، قومی تعلیم عام ہوئی اور قومی پریس قایم کیا گیا تاکہ قومی ادب و کلچر کی تعمیر کے لئے معمار پیدا کئے جائیں

۱۹۳۴ء میں شہر روستوف میں تمام سوویٹ اہلِ قلم کی پہلی کانگریس ہوئی تھی جس کی صدارت گورکی نے کی تھی۔ اس کانگریس میں چھ سو نمایندے شریک ہوئے۔ ان میں اکثریت ایسے اہلِ قلم کی تھی جو چھوٹی قوموں کی نمایندگی کرتے تھے۔ اور یہ اکثریت پچاس مختلف زبانوں کے نمایندوں کی تھی۔ گورکی کے خطبۂ صدارت کے یہ فقرے آپ اپنی شرح کرتے ہیں:

"..... سوویٹ ادب سے مراد روس خاص کا ادب نہیں بلکہ وہ تمام ادب ہے جو یونین کے مختلف حصوں میں پیدا ہو رہا ہے ..... یاد رکھنا چاہئے کہ آج اس وقت سوویٹ یونین کے طول و عرض میں تمام محنت کش عوام ایک متدین زندگی کے لئے، آزادانہ تخلیق کیلئے سرگرم عمل ہیں ....."

وسط ایشیا کے اہل قلم

پچھلے دس پندرہ برسوں میں وسط ایشیا کے اکثر اہل قلم کے ادبی کارنامے روسی و دیگر زبانوں میں منتقل ہو کر مشہور ہو چکے ہیں جن میں ازبکستانی شاعر عفور غلام، حامد علیم جان، شیخ زادہ اور الیغوں، تاجیک شاعر و ادیب صدرالدین عینی، لاہوتی، عزیز اور ربیع، ترکمانی شاعر بردہ باباتیف، امان گلیلات اور نصرت علی سعید دف، کازاک شاعر اعظم جمبول زابر اور نرگنیا کا شاعر سلیمان سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کا کلام تقریباً ہر سوویٹ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے

اشتراکی تعمیر کے پروگرام میں جب ادب و کلچر پر توجہ کی گئی تو زندگی کے دوسرے کاموں کی طرح، بہت سے مشکل سوال سامنے آئے۔ شروع میں مختلف نسل کے لوگوں میں قومی تحریکیں ابھریں: اتحاد ترکیہ، اتحاد اسلامیہ، اتحاد سلافیہ وغیرہ لیکن بنیادی طور پر ایسی تحریکیں رجعتی تھیں یعنی REVIVALISM پر مبنی تھیں اس لئے زیادہ ٹھہر نہ سکیں اور جب یہ طوفانی دور گزر گیا جس میں پرانی نسل کے لوگ زیادہ پیش پیش تھے تو اصل اور حقیقی مسئلے سامنے آئے۔ اس وقت سوویٹ قوموں کی بین الاقوامی ترقی نے نئی راہیں تلاش کیں۔ اس وقت کے ادبی مسایل کی نوعیت بھی عجیب تھی۔ ایک سوال یہ تھا کہ زبان کے معیار سی ادب اور اس کے لوک گیتوں کا تعلق کیا ہو؟ دوسرا سوال یہ اُٹھا کہ ادبی زبان کی ترقی کی حدیں کیا ہوں؟ ایک یہ معمہ بھی حل طلب تھا کہ لکھنے اور پڑھنے والوں کے کلچری معیار میں فرق ہوتا ہے! چوتھی مشکل یہ نظر آئی کہ دوسری زبانیں روسی زبان کا اثر قبول کریں یا نہ کریں؟ اور کریں تو کس حد تک؟ یہ سوال بھی تھا کہ نیا ادب کلاسکی ادب کی روایات کا اتباع کس حد تک کرے؟ سوال تو اور بھی بہت سے اُٹھے مگر حل سب ہو گئے

"سوویٹ ادب کا پیکر قومی اور اس کا وصف اشتراکی ہوگا!" یہ خصوصیت غالباً سوویٹ قوموں ہی کے ادب کو حاصل ہے کہ اس نظریے کی بدولت ان کے معیاری اور عوامی ادب میں فرق نہیں رہا۔ اور اس مقصد کے حاصل ہونے میں کسی خاص کوشش کو دخل نہ تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک سوویٹ نظام میں ایسے سازگار حالات پیدا نہ ہوسکے تھے جو معیاری ادب کی پیداوار کے لئے موافق فضا بنا سکتے، مگر عوامی شاعروں نے انقلابی موضوع پر گیت شروع کر دئے جو گاؤں گاؤں پہونچ گئے

ان "گشتی" شاعروں کو مختلف قوموں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، ترکمانیہ میں اُشک کہلاتے ہیں اور کازکستان میں اکین، تاتاریا میں بخشی کہے جاتے ہیں اور کہیں صرف شاعر۔ بہرحال سوویٹ عوام میں سوویٹ ادب کا بیج بونے والے یہ "گشتی" شاعر ہی تھے جو ہمیشہ گمنامی میں رہے۔ کبھی کسی نے نہ ان کا نام جانا نہ ان کے جوہر کو تسلیم کیا۔ لیکن سوویٹ نظام نے حالات کو بالکل بدل دیا ہے۔ سوویٹ ادب کی بے مثال ترقی ہر قوم کے عوامی شاعروں کو منظر عام پر لے آئی ہے۔ بہت سے شاعر جو پہلے اس جماعت میں شامل تھے آج اساتذہ ادب کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا کلام کلاسک میں شمار ہوتا ہے جیسے جمبول زابر اور سلیمان، ان کا کیا ہوا ایک ایک لفظ اور ان کی زندگی کے متعلق ایک ایک بات بیس کروڑ انسانوں تک جا پہونچتی ہے

عوامی شعراء کا وصف

انقلاب اور انقلابی موضوعات کی جو اہمیت عوامی شاعروں کے سامنے تھی ظاہر ہے کہ دیہاتی عوام اس کو سمجھ سکتے تھے اس لئے ان عوامی شاعروں نے یہ کیا کہ عوام کو صرف وہ اتنی بات سنائے جو عوام آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ یہ کھلی حقیقت تھی کہ زار شاہی کے اندر کتنی خرابیاں تھیں اور سوویٹ نظام نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیسی کاری ضرب لگائی ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی پہچانتے تھے کہ رجعت پسند طبقہ اس نئے نظام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ چنانچہ ان شاعروں کے اُس وقت کے مجموعۂ کلام سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان لوگوں نے اس وقت کے حالات کی رعایت ملحوظ رکھی اور دیہاتی عوام کو حقیقتیں سمجھانے میں احتیاط اور دانشمندی سے کام لیا۔ ان شاعروں نے نئے حالات کے نتیجے نکال کر اپنے سننے والوں کو تعلیم دی، اور ان کے خیالات کی نوعیت ایسی ہوتی تھی جو انسان فطرت کو حرکت میں لائے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ ماضی کی کراہتیں اور مستقبل کی برکتیں اس سادہ طریق پر پیش کیں کہ دیہاتی عوام کے ذہن نشین ہوگئیں

سوویٹ طاقت کے وجود میں آتے ہی وسط ایشیا کے کوہستانی علاقے ان گمنام شاعروں کے نغموں سے گونج اُٹھے تھے۔ آزاد شدہ انسانیت کے قصیدے، آزادی کے لیڈر لینن کی ثنا و صفت، نومولود جمہوریت کے لئے جہاد حریت کے نعرے، رجعت پسندوں کو نیست و نابود کرنے پر سرخ فوج کے گیت، یہ تمام باتیں ان کی شاعری کا موضوع تھیں۔ ایسے شاعروں میں جمبول زابر، سلیمان، دردتی قلیچ، اُغ، تقبازا در فرح وغیرہ بہت سے تھے جنھوں نے کشادہ آغوش انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا

اس طرح دیہادی عوام کے اندر نئی زندگی کا شعور اُبھرا اور اسے بیان کرنے میں معیاری ادب کو اس عوامی ادب یا لوک گیتوں سے بہت مسالا ملا۔ ایک طرف اسکول کی ریڈریں چھاپ کر بے پڑھے لکھے عوام میں پریس زبردست خدمت انجام دے رہا تھا تو دوسری طرف یہ عوامی شاعر تخلیقی کارنامے مرتب کر رہے تھے۔ سوویٹ واقعیت نگاری کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ کل کے بے پڑھے لکھے بھاٹ یا آج کے دیہاتی لڑکے، شعر و صحافت کی دُنیا میں مرد میدان بن گئے

اوپر ذکر آچکا ہے کہ سوویٹ نظام نے چالیس مختلف قوموں کے لئے مناسب حال حروف تہجی بہم پہونچائے۔ یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنی آسانی سے کہدیا گیا۔ بلکہ ایک کار اہم تھا جس کی مختصر تفصیل جاننا فایدے سے خالی نہ ہوگا

جن قوموں کی کوئی تحریری زبان نہ تھی ان میں ایک زبردست مشکل یہ بھی تھی کہ ہر قوم مختلف و متعدد قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی، اور ان قبیلوں کی بولیاں بنیادی طور پر تو ایک تھیں مگر ہر قبیلے کی ایک خاص فرہنگ بھی تھی۔ گویا زبان کی شاخیں موجود تھیں مگر تنہ غائب تھا اور چونکہ کوئی قومی زبان موجود نہ تھی اس لئے ان تمام قبیلوں کی ایک قومی وحدت بنا دینے کا کام اتنا ہی مشکل ہوگیا تھا جتنا نقطے کے بغیر خط کھینچنا دشوار ہوتا ہے

لیکن سوویٹ لیڈروں کی مخلصانہ دل سوزی اور دیدہ ریزی نے اس اہم مشکل کو بھی حل کر لیا، ماہر مقرر کئے گئے اور انھوں نے ایک قوم کے تمام قبیلوں کی بولیوں کو اکٹھا کیا، اور پھر فضولیات کو چھانٹ کر ایک قومی زبان کی ایک لغت مرتب کر لی جس پر سے درسی کتابیں لکھی گئیں، اخبار جاری کئے گئے اور بالآخر ایک ادبی زبان بن کر ادبی سرمایہ وجود میں آنے لگا اور پھر قومی استحاد از خود پیدا ہو گیا

وسط ایشیا کی جدید شاعری سوویٹ رُوس کی تمام پچھڑی قوموں کی جدید شاعری اور کلچری ترقی میں قومی پریس سب سے زیادہ قابل تحسین ہے، جس نے درسی کتابیں اور بے شمار اخبار شایع کر کے جدید شاعری کو مقبول بنایا۔ ہر اخبار میں نظم کا حصہ ضروری ہو گیا تھا۔ اس وقت کی شاعری کا رنگ قدرتی طور پر طنزیہ اور مزاحیہ تھا اس لئے مقبول عوام ہو جانے میں آسانی بھی تھی۔ اس کے بعد ہی فیکٹریوں اور تعلیم گاہوں نے اپنے مختصر اخبار نکالنا شروع کر دئے۔ اس طرح بھی شعر و سخن کو چمکنے کا بڑا موقعہ ملا۔ اور جب دیہاتوں میں اسکولوں کا جال پھیل گیا تو اسکول ٹیچروں نے ہر گاؤں سے مقامی اخبار نکالنے شروع کر دئے۔ دیہات میں تعلیم عام ہوئی تو ہر شخص پڑھا لکھا بن گیا اور اس طرح بہت سے جوہر قابل پیدا ہو گئے جن میں سے بعض بعض مستند اہل قلم بن گئے۔ اس کی ایک مثال بوڑھا تاجیک ربیع ہے جس نے تعلیم بالغان کی اسکیم کے تحت پڑھنا لکھنا سیکھا۔ پھر ربیع نے مضمون نویسی شروع کی اور پہلا مضمون قدامت پرستی کے خلاف لکھا اور خود لے کر اسٹالین آباد پہونچا جو تاجکستان کا مستقر ہے۔ اخبار تاجکستان کے دفتر میں مضمون شایع ہونے کو دیا اور اس اخبار کا مستقل نامہ نگار بن گیا۔ آج ربیع کی تصانیف دوسری سوویٹ زبانوں میں ترجمہ ہو رہی ہیں

کلچر اور عوام اول اول سوویٹ یونین کے اندر اور خاص طور سے وسط ایشیا کے ملکوں میں جو شعر و ادب پیدا ہوا اس میں ایک قسم کا تذبذب تھا، غیر قطعیت تھی۔ ہر چند اس سے پہلے زمانے میں روسی عوام ایسے ادب کی بھی آرزو کرنے کے مجاز نہ تھے، پرانے زمانہ میں وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ انھیں ادب کی ضرورت ہے، ادب ان کے لئے پیدا ہونا چاہئے

تعلیم عام ہونے کے ساتھ اخباروں کی کثرت سوویٹ کلچر کی ترقی کی پہلی سیڑھی تھی، عوامی کلچر کی تیز ترقی کا دوسرا بڑا سبب اور ذریعہ تھیٹر بنا اور جتنی خدمت مستقل تھیٹروں نے کی اتنی ہی شوقیہ ڈراما کرنے والی ٹولیوں نے بھی کی۔ سیول وار ابھی پوری طرح ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ شوقیہ ڈرامہ کرنے والوں کی ناٹک منڈلیاں دور افتادہ علاقوں میں پہونچنے لگ گئیں۔ شروع شروع میں یہ ناٹک منڈلیاں اخباروں میں چھپنے والے مضامین کو مکالموں کی شکل دیکر اسٹیج پر لے آتی تھیں، اور یہ ناٹک زیادہ تر دیہاتی میلوں اور ہاٹوں میں دکھائے جاتے تھے۔ آج ہر جمہوریت میں قومی تھیٹروں کی عالی شان عمارتیں کھڑی ہو گئی ہیں۔ دیہاتی میلوں میں ناٹک کے کھیل پہلے سے بھی مقبول تھے۔ لیکن انقلاب سے پہلے ان ناٹکوں کی نوعیت مذہبی ہوتی تھی وسط ایشیا کے عوام ایسے مذہبی ناٹکوں کو "ذکر" کہتے تھے، اور شمالی قفقاز والے "شمانی" یہ ذکر یا شمانی مذہبی روایتوں سے اخذ کئے جاتے تھے۔ ہمارے یہاں کی رہس ان ناٹکوں سے ملتی جلتی چیز ہے — تیسرا کلچری ترقی کا تیسرا بڑا ذریعہ کھیل کود تھے۔ وسط ایشیا میں جتنے عوامی کھیل کھیلے جاتے تھے، سوویٹ کلچر کے مبلغوں نے ان کھیلوں سے بھی کام لیا اور کچھ اصلاح کر کے ان میں ناچ گانے کا اضافہ کر کے بہت دلچسپ و مفید بنا دیا۔ خیوا کے بازاروں اور تاش حوض کے دیہاتوں میں جتنے قصے کہانیاں مقبول عوام تھیں ان سب کو اسکیچوں اور ڈراما کی صورت دیدی گئی جنھیں دہقان پسند کر سکتے تھے۔ بعد میں یہی ڈرامے مستقل تھیٹر کے وجود میں آنے کا سبب بن گئے۔ اکیلے ترکمانیہ کے اندر دس تھیٹر کمپنیوں کی ابتدا اسی طرح ہوئی تھی — تاشقند کا حمزہ تھیٹر[1] جو ایک بلند پایہ شاعر و ڈراما نگار کے نام پر بنا ہے اور سوویٹ یونین کے نہایت مقتدر تھیٹروں میں سے ایک ہے، اس تھیٹر کی ابتدا بھی ایک ناٹک منڈلی سے ہوئی جس کا لیڈر حمزہ حکیم زادہ تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ ان منڈلیوں نے بہت سے نامور ڈراہ نگار اور ایکٹر پیدا کئے۔ ایسے فن کاروں میں حمزہ کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ حمزہ ایک ازبک ڈراما نویس شاعر اور موسیقار تھا۔ اس کے ادبی اور صناعتی کارنامے سوویٹ ادب کے کلاسک میں گنے جاتے ہیں۔ حمزہ پہلا غیر روسی فنکار تھا جسے یہ بلند مرتبہ حاصل ہوا۔ اس کی تصانیف بہت ہیں اور سب مقبول ہوئیں، مگر "بے اور دہقان" اور "دو طوفان" کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی۔ اس کے ڈرامے آج بھی کھیلے جا رہے ہیں۔ وہ اگرچہ قبل انقلاب کا اہل قلم تھا مگر اس کے خیالات ہمیشہ ترقی پسندانہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شروع ہی سے عوام میں مقبول تھا۔ رجعت پسند جماعت نے حمزہ کو قتل کرا دیا۔

(باقی)

لطیف الدین احمد

---

[1] حمزہ حکیم زادہ پر ایک جداگانہ مضمون طیار کر رہا ہوں۔ ل۔ احمد

انسان و انسان اعلیٰ

(برنارڈ شا کے ڈرامہ کا ایک حصّہ)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

فرزان ـــــ آج بہت خوش طبع نظر آتے ہو تم ـــ آخر معاملہ کیا ہے ؟

مجسّمہ ـــــ میں نے ایک زبردست فیصلہ اور ایک انقلابی عزم کیا ہے میرے دوست ! ـــ مگر پہلے یہ بتلاؤ کہ ہمارا دوست ابلیس کہاں ہے۔ اس معاملہ میں مجھے اس سے مشورہ لینا ضروری ہے ـــ اور بلاشبہ سارا بھی تو اس سے متعارف ہونا چاہتی ہوگی

سارہ ـــــ تم میرے واسطے عذاب و عقوبت کی تیاریاں کر رہے ہو

فرزان ـــــ یہ سب توہم پرستی ہے سارہ ! ـــ یقین کرو ـــ یاد رکھو ابلیس اس قدر "سیاہ فام" نہیں جتنا کہ دکھایا جاتا ہے

مجسّمہ ـــــ آؤ اُسے آواز دیں

(مجسّمہ کے ہاتھ کی ایک حرکت پر موسیقی کی بلند آوازیں پھر لہرانے لگتی ہیں ..... روشنی کا ایک سرخ حلقہ چمکنے لگتا ہے اور اس کے اندر سے ابلیس نمودار ہوتا ہے۔ وہ سن رسیدہ معلوم ہوتا ہے اور اس کا سر قبل از وقت بالوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک خفیف سی نیک طینتی، دوست پروری اور مہربانی کی جھلک کے باوجود اس کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ اگر اس کے اقدامات کا مطمئن کن جواب نہ دیا جائے تو وہ برہم ہو جاتا ہے۔ اُس کو دیکھ کر اس کی محنت و مشقت یا تحمل و رواداری کی قوتوں پر کچھ زیادہ اعتماد پیدا نہیں ہوتا اور وہ مجموعی طور پر ایک ناگوار حد تک خود غرض ہستی نظر آتا ہے۔ لیکن وہ چالاک ہے اور چرب زبان ـــ ان دو مردوں کی بہ نسبت اُسے اچھی تربیت کم ملی ہے اور اس عورت کے مقابلہ میں اس کے اندر زندگی کی قوتیں حد سے زیادہ کم ہیں)

ابلیس ـــــ (خلوص کے ساتھ مجسّمہ سے مخاطب ہو کر) کیا مجھے آج پھر اس عالی مرتبہ شخصیت کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے ؟ ـــ (فرزان سے سرد مہری کے ساتھ) اپنے خادم کا سلام لو فرزان ـــ (سارہ سے مہذب انداز میں) اجنبی خاتون ؟ ـــ آداب عرض !

سارہ ـــــ کیا تم .....

ابلیس ـــــ (سر بخم ہو کر) جی ہاں ـــ ابلیس ـــــ آپ کا خادم !

سارہ ـــــ میں پاگل ہو جاؤں گی

ابلیس ـــــ (جری لہجہ میں) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں محترمہ ـــ آپ کرۂ ارض سے ہمارے پاس آئی ہیں۔ وہ دنیا مذہب کے نام لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں کی غلام ہے۔ آپ ابھی تک اسی دنیا کی عصبیت اور خوف و دہشت میں مبتلا ہیں۔ آپ نے وہاں لوگوں کو میری مذمت کرتے سُنا ہے لیکن یقین کیجئے کہ اس کے باوجود وہاں میرے دوست گروہ در گروہ موجود ہیں

سارہ ـــــ ہاں - تم اُن کے دلوں پر حکومت کرتے ہو

ابلیس ـــــ یہ آپ کا حُسن ظن ہے محترمہ ـــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کا کام میرے بغیر نہیں چل سکتا لیکن دنیا اس پر

میرا شکریہ ادا نہیں کرتی۔ اپنے دل میں وہ مجھ سے بدظن ہے اور نفرت کرتی ہے۔ اس کی تمام ہمدردیاں تو مصیبت و ذلت، افلاس و فلاکت اور جسم و قلب کی بھوک کے ساتھ ہیں۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ اپنی ہمدردی کو حصولِ مسرت کی طرف متوجہ کرے — محبت کی طرف — راحت و سکون کی طرف — حُسن و جمال کی طرف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فرزان — (نفرت سے) معاف کرنا — میں جا رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا

ابلیس — (برہمی سے) ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے دوست نہیں ہو

مجسمہ — تمھیں کیا نقصان پہونچا رہا ہے یہ — فرزان؟ میرے خیال میں تو وہ خاصی معقول باتیں کر رہا تھا، جب تم نے بات کاٹ دی!

ابلیس — (مجسمہ کے ہاتھ کو گرمجوشی سے تھپکی دیتے ہوئے) شکریہ دوست! — شکریہ! — تم ہمیشہ میرے مفہوم کو اچھی طرح سمجھے ہو اور یہ ہمیشہ میری تحقیر کرتا رہا ہے اور مجھ سے پرہیز کرتا ہے

فرزان — میں نے تمھارے ساتھ ہمیشہ مکمل اخلاق کا برتاؤ کیا ہے

ابلیس — اخلاق! — اخلاق کیا چیز ہے؟ — میں اخلاق محض کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی قلبی محبت دو۔ حقیقی خلوص — محبت و مسرت کے احساسات میں میری شرکت کرو ۔۔۔۔۔۔۔۔

فرزان — تم مجھے بدمزہ کر رہے ہو

ابلیس — یہ دیکھو! — (مجسمہ سے مخاطب ہوکر) تم سنتے ہو؟ — کیسی زبردست ستم ظریفی ہے تقدیر کی یہ سرد احساس والا خود غرض اور خود پرست شخص میری اقلیم میں بھیج دیا گیا اور تم جنت کے برفانی قصور میں پہونچا دئے گئے!

مجسمہ — میں یہ شکوہ نہیں کر سکتا۔ میں ایک ظاہر پرست منافق تھا اور میرے حق میں یہ انصاف صحیح ہے کہ مجھے جنت میں بھیج دیا گیا

ابلیس — تم ہمارے ساتھ شریک کیوں نہیں ہو جاتے اور اس خطّہ کو خیرباد کیوں نہیں کہدیتے جو تمھارے انتہائی ہمدردانہ مزاج — تمھارے انتہائی محبت کیش دل اور تمھاری شدید تشنگیِ کیف و مسرت کے لحاظ سے بالکل غیر موزوں ہے؟

مجسمہ — میں نے آج ایسا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج سے میں صرف تیرا ہوں اے "فرزندِ صباح"! میں نے جنت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا ہے

ابلیس — (مرمریں ہاتھوں کو ایک بار چھوتے ہوئے) اوہ! — کتنا بڑا اعزاز ہے یہ میرے لئے! — کیسی زبردست فتح ہے ہمارے مقاصد کی! — شکریہ! — شکریہ! — اور کیوں دوست کیا تم اس شخص کو یہ ترغیب نہیں دے سکتے کہ جو جگہ تم عالمِ بالا میں خالی چھوڑ آئے ہو اس کو یہ پُر کر دے؟

مجسمہ — (نفی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے) میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ایک ایسے شخص کو جو میرا دوست رہ چکا ہے یہ مشورہ دوں کہ وہ دیدہ و دانستہ اپنی زندگی کو بے کیف اور اذیت انگیز بنا لے

ابلیس — بالکل صحیح کہا تم نے — لیکن کیا تمھیں یقین ہے کہ اس شخص کو وہاں کوئی تکلیف ہوگی؟ اس میں شک نہیں کہ سب سے زیادہ تم ہی اس انسان سے واقف ہو — ابتدا میں تم ہی اس کو یہاں لائے تھے — اور ہم کو اس سے بڑی امیدیں تھیں۔ اس کا وجدان و ذوق ہمارے خطّہ کے بہترین لوگوں سے بہتر تھا۔ یاد نہیں تمھیں یہ کیسے گایا کرتا تھا؟ (دھیرے دھیرے گنگنانے لگتا ہے)

(مجسمہ بھی نغمہ ابلیس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر گنگنانے لگتا ہے)

ابلیس — ہاں بالکل اسی طرح — مگر اب یہ ہمیں اپنے نغمات سے محظوظ نہیں کرتا

فرزان — تمھیں اور اس کا شکوہ؟ — جہنم موسیقی کے دلدادوں سے لبریز ہے۔ موسیقی جہنمی لوگوں کی شراب ہے۔ کیا ایک گمراہ روح کو اس شراب سے پرہیز کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی؟

تم ایک بلند ترین و پاکیزہ ترین فنِ لطیف کے خلاف اہانت آمیز الفاظ ادا کرنے کی کافرانہ جرأت کر رہے ہو!

فرزان ـــــ (سرد نفرت سے) تمہارے الفاظ بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی نیم دیوانہ عورت کسی مغنی کی چاپلوسی کر رہی ہو

ابلیس ـــــ تمہاری باتیں مجھے برہم نہیں کر سکتیں - مجھے تو تمہاری حالت پر ایک حقارت آمیز افسوس ہوتا ہے - تمہارے پاس روح باقی نہیں اور پھر جن چیزوں سے تمہارا دامن خالی ہوتا جاتا ہے ان کا وقوف و شعور تمہیں نہیں ـــــ (مجسمہ سے مخاطب ہو کر) تم ایک فطری و پیدائشی مغنی ہو - کیسا اچھا گاتے ہو تم ! ـــــ موزارت اگر یہاں رہتا تو تمہیں سنکر مسرور ہوتا - لیکن یہاں وہ گھبرا گیا اور جنت میں چلا گیا - کیسی عجیب بات ہے کہ بعض خاصے سمجھدار لوگ جن کے متعلق خیال کیا جا سکتا تھا کہ یہاں ہر دلعزیز رہیں گے انجام کار یہاں ہماری سوسایٹی میں ناکام انسان ثابت ہوئے ـــ فرزان کی طرح

فرزان ـــــ سوسائٹی میں ایک ناکام انسان ثابت ہونے پر مجھے درحقیقت بہت افسوس ہے

ابلیس ـــــ یہ بات نہیں کہ ہم تمہاری ذکاوت و ذہانت کے مداح نہیں - ہم اس کے معترف ہیں لیکن میں اس مسئلہ کو تمہارے نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا - یہ جگہ تمہیں موافق نہیں آئی - درحقیقت ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تمہارے پاس دل نہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اپنی تمام قنوطیت اور نفرت کیشی کے پیچھے تم ایک محبت بھرا دل رکھتے ہو ـــــــــ

فرزان ـــــ (کانپتے ہوئے) رہنے دو - بس کرو

ابلیس ـــــ (برہمی سے) بہتر ـــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم میں کیف و مسرت کی اہلیت ہی نہیں ـــ ٹھیک ہے نا ؟

فرزان ـــــ یہ الفاظ بھی منافقت سے خالی نہیں لیکن پہلے سے کچھ کم ناقابل برداشت ـــ بہرحال اگر تم اجازت دو تو میں حسب معمول گوشۂ تنہائی میں پناہ لینا چاہتا ہوں

ابلیس ـــــ تم گوشۂ جنت میں کیوں پناہ نہیں لیتے ؟ ـ وہ جگہ تمہارے لئے موزوں ہے - (سارہ سے) کیا آپ بھی اسے یہ ترغیب نہیں دیں گی کہ اپنی بہبودی کی خاطر ذرا آب و ہوا تبدیل کرے ؟

سارہ ـــــ لیکن اگر وہ جنت میں جانا چاہے تو کیا ایسا ممکن ہے ؟

ابلیس ـــــ کیوں نہیں ! ـ روک ہی کون سکتا ہے ؟

سارہ ـــــ کیا ہر شخص ـــ کیا میں بھی جنت میں جا سکتی ہوں ؟

ابلیس ـــــ (قدرے تنفر سے) یقیناً ـــ بشرطیکہ آپ کا ذوق اس نوعیت کا ہو

سارہ ـــــ پھر ہر شخص جنت میں کیوں نہیں چلا جاتا ؟

مجسمہ ـــــ (مسکراتے ہوئے) یہ راز میں بتا سکتا ہوں عزیزہ ـــــ وجہ یہ ہے کہ جنت تمام کائنات میں سب سے زیادہ بے کیف جگہ ہے

ابلیس ـــــ ہمارے کپتان صاحب نے تو بالکل صاف الفاظ میں حقیقت کہہ ڈالی - واقعہ یہ ہے کہ جنت کی زندگی بڑی صبر آزما چیز ہے - لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے وہاں سے نکال دیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں قیام کرنے پر کوئی چیز مجھے مایل ہی نہیں کر سکتی تھی - سیدھی بات یہ ہے کہ میں نے خود ہی جنت کو چھوڑ دیا

مجسمہ ـــــ مجھے اس میں ذرا بھی تعجب نہیں ـــ ایک ابدی فردوسی زندگی کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا

ابلیس ـــــ نہیں ـــ کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو یہ زندگی موافق آتی ہے - ہمیں انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے - کپتان صاحب ـــــ یہ معاملہ تو بالکل افتادِ طبع سے تعلق رکھتا ہے - میں فردوسی قسم کے مزاج و ذوق کا قایل نہیں - ایسا ذوق میری سمجھ ہی میں نہیں آتا - لیکن کائنات کی تشکیل و تکمیل کے لئے تو ہر قسم کی چیزوں کی ضرورت ہے - ذوق و طبع کی قسموں کا کوئی شمار نہیں - ایسے لوگ بھی ہیں جو جنت کو پسند کرتے ہیں - میرا خیال ہے فرزان کو یہی پسند ہے

فرزان ـــــ لیکن ـــ صاف گوئی معاف ـ اگر تم جنت میں جانا چاہتے تو کیا واقعی وہاں واپس جا سکتے تھے ؟ ـــ یا محض انگور کھٹے ہیں ؟

ابلیس ـــــ واپس اور وہاں! ـــ میں اکثر وہاں جاتا ہوں۔ کیا تم نے کتابوں میں ایسا نہیں پڑھا؟ کیا تمہارے پاس اس بات کی کوئی سند ہے کہ ہمارے خطے اور فردوسی طبقے کے درمیان کوئی حدِ فاصل موجود ہے

سارہ ـــــ لیکن درمیان میں ایک بڑی خلیج تو ضرور حایل ہے

ابلیس ـــــ محترمہ! ایک استعارہ کا مفہوم کبھی حقیقی حیثیت سے نہ لینا چاہئے۔ یہ خلیج دراصل ملکوتی اور ابلیسی ذوق کے باہمی فرق کی خلیج ہے۔ اس سے زیادہ ناقابل عبور خلیج اور کونسی ہو سکتی ہے؟ ـــ آپ نے زمین کی سطح پر جو کچھ دیکھا ہے اس پر غور کیجئے۔ ایک فلسفی کے دارالتعلیم اور بٹیر بازوں کے حلقہ کے درمیان کیا کوئی مادی خلیج حایل ہے؟ ـ لیکن اس کے باوجود یہ بٹیر باز کبھی اس دارالتعلیم میں نہیں آتے۔ کیا آپ نے کبھی اس ملک کی سیر کی ہے جہاں میرے سب سے زیادہ متبعین ہیں؟ ـــ یعنی انگلستان؟ ـــ وہاں گھوڑ دوڑ کے وسیع میدان ہیں ـــ اور بہت سے سرود خانے بھی ہیں جہاں لوگ ہمارے کپتان صاحب کے دوست موزارت کے تخلیق کردہ نغمات گاتے بجاتے ہیں۔ لوگ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں ـــ گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں بھی اور سرود خانوں میں بھی ـــ اس معاملہ میں انھیں روکنے والا کوئی قانون نہیں کیونکہ انگریز کہتے ہیں کہ وہ کبھی غلام نہیں ہو سکتے ـــ وہ ہر کام آزادی سے کر سکتے ہیں جسکی اجازت اُنھیں حکومت اور رائے عامہ دیتی ہے ـــ اور پھر یہ بھی ہے کہ ایک گھوڑ دوڑ کے میدان کی بہ نسبت ایک معیاری سرود خانہ زیادہ بلند۔ زیادہ مہذب۔ زیادہ شاعرانہ۔ زیادہ ذہنی اور زیادہ شریفانہ مقام تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑ دوڑ کے پرستار اپنا شغل چھوڑ کر سرود خانے میں گروہ در گروہ چلے آئیں؟ ـــ نہیں! ـــ اُنھیں وہاں اسی اضمحلال کبیدگی اور کوفت کی اذیت سہنی پڑے گی جو ہمارے دوست کپتان کو جنت میں برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ان دونوں مقامات کے درمیان استعارہ کی ایک بڑی خلیج حایل ہے۔ اگر محض مادی خلیج ہوتی تو اسے یہ لوگ آسانی سے عبور کر سکتے تھے یا کم از کم اس مادی خلیج پر ان لوگوں کے واسطے ایک پُل تعمیر کیا جا سکتا تھا، لیکن ناپسندیدگی کی خلیج ناقابل عبور ہے اور ابدی

سارہ ـــــ میں تو اسی وقت جنت میں جاتی ہوں

مجسمہ ـــــ میری بچی! پہلے دو باتیں سن لو ـــ میرے دوست ابلیس نے سرود خانے کی جو مثال پیش کی ہے مجھے ذرا اسے پورا کرنے دو۔ انگلستان میں ہر سرود خانے کے اندر تمھیں ایسے پژمردہ تھکے ہوئے لوگوں کی قطاریں نظر آئیں گی جو وہاں اس لئے نہیں آئے کہ اُنھیں درحقیقت قدیم معیاری موسیقی مرغوب ہے بلکہ وہاں صرف اس لئے موجود ہیں کہ اُن کے خیال میں یہ موسیقی اُن کو مرغوب ہونا چاہئے۔ بالکل یہی بات جنت میں ہے۔ وہاں بہت سے لوگ شان و شوکت سے فروکش ہیں اس لئے نہیں کہ وہ مسرور ہیں بلکہ اس واسطے کہ اُن کے خیال میں اُنکے بلند مرتبہ کا یہی تقاضہ ہے کہ وہ جنت میں رہیں۔ ایسے لوگ تقریباً سب کے سب انگریز ہیں

ابلیس ـــــ ہاں۔ جنوبی ممالک کے لوگ تمہاری طرح جنت کو چھوڑ کر یہاں میرے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز جب انتہائی مصیبت میں ہوتا ہے تو اُسے اپنی حالت کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر ایک انگریز کو اپنی راحت میں خفیف سا خلل محسوس ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ نیکی کے راستہ پر ہے

مجسمہ ـــــ مختصر یہ کہ اگر تم جنت کے فطری استحقاق اور طبعی موزونیت کے بغیر وہاں جاؤ گی تو وہاں تمھیں مسرت حاصل نہ ہو گی

سارہ ـــــ اور کیا کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ میں اس کے لئے فطری استحقاق و طبعی موزونیت نہیں رکھتی؟ ـــ میرے اس حق پر کلیسا کے بڑے بڑے پیشواؤں نے بھی کبھی کوئی شک و شبہ نہیں کیا۔ میرا یہ فرض ہے کہ اس مقام سے فوراً چلی جاؤں

ابلیس ـــــ (ہنسی سے) آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ لیکن مجھے آپ سے بہتر ذوق کی توقع تھی

سارہ ـــــ آہا! ـ مجھے توقع ہے کہ میرے ساتھ تم بھی چلو گے ـــ یہاں نہیں ٹھہر سکتے تم ـــ لوگ کیا کہیں گے؟

مجسمہ ـــــ لوگ! ـ واہ ـــ بہترین لوگ تو اسی جگہ موجود ہیں ـــ کلیسا کے پیشوا اور سب ـــ جنت میں اس قدر کم لوگ جاتے ہیں اور یہاں اتنے

زیادہ کہ "فردوسی آبادی" اب ایک زوال پذیر اقلیت ہوتی جاتی ہے۔ عہدِ قدیم کے مذہبی بزرگ۔ دینی پیشوا، آجکل کے وہمی خبطی انسان ہیں

ابلیس ـــ بالکل صحیح۔ مجھے پہلے سے یہ علم تھا کہ میرے خلاف لعنت وملامت کا جو ہنگامہ برپا ہے، اس میں انجام کار رائے عامہ کی بدولت مجھی کو فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔ اپنے خمیر وفطرت کے لحاظ سے کائنات ایک باضابطہ جمہوریت ہے ـــ اور اتنی بڑی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنانے کے بعد ..... یہ ناممکن ہے کہ مجھے میرے واجب عہدے سے معزول رکھا جائے

فرزان ـــ میرے خیال میں بہتر یہ ہے سارہ کہ تم اسی جگہ قیام کرو

سارہ ـــ (رشک وحسد سے) تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں

فرزان ـــ یقیناً تم مجھ جیسے اوباش کے ساتھ جنت میں رہنا پسند نہ کروگی

سارہ ـــ روحیں سب یکساں ہیں۔ پھر تم تو توبہ بھی کر چکے ہو؟

فرزان ـــ عزیز سارہ! تم بے وقوف ہو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ جنت بھی کرۂ ارض کی طرح ہے جہاں لوگ اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ "کردہ" افعال توبہ واستغفار کے ذریعہ "ناکردہ" بنائے جاسکتے ہیں ـــ "گفتہ" کو معذرت کے ذریعہ سے "ناگفتہ" میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور "حقیقت" کو متفقہ طور پر "جھوٹ" قرار دیکر مٹایا جاسکتا ہے؟؟ ـــ نہیں! ـــ جنت ایک ممکن ہے حقیقت کے آقاؤں کا ـــ اور اسی لئے میں وہاں جارہا ہوں

سارہ ـــ اس نصیحت کا شکریہ! ـــ لیکن میں تو مسرت کے حصول کے لئے جنت میں جارہی ہوں۔ "حقیقت" کو تو میں کرۂ ارض پر کافی بھگت چکی ہوں

فرزان ـــ یہ بات ہے تو تمھیں یہیں قیام کرنا چاہئے کیونکہ جہنم ممکن ہے "عدم حقیقت" کا اور مسرت کے تلاشیوں کا۔ جنت اور کرۂ ارض دونوں سے پناہ حاصل کرنے کی جگہ یہی ہے، کیونکہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں جنت حقیقت کے آقاؤں کا مسکن ہے اور کرۂ ارض حقیقت کے غلاموں کا۔ زمین کی دنیا بچوں کی ایک پرورش گاہ ہے جہاں مرد اور عورت ہیرو اور ہیروئن یا اولیا و فاجر سب ملکر ایک کھیل کھیلتے ہیں۔ لیکن اُن کی اس خیالی دنیا سے جو "فردوس حمقاء" سے تعبیر کی جاسکتی ہے اُن کے جسم اُن کو گھسیٹ کر بستی میں ڈھکیل دیتے ہیں ـــ بھوک اور پیاس سردی وگرمی۔ کہولت وانحطاط۔ مرض وتکلیف ـــ اور پھر سب کے بعد موت اُن کو حقیقت کا غلام بنا دیتی ہے۔ ہر روز تین چار بار کھانا کھانا اور ہضم کرنا ضروری ہے ـــ ہر صدی میں تین بار ایک جدید نسل پیدا کرنا لازم ہے ـــ مذہب وعقیدت۔ رومان ورنگینی ـــ اور سائنس کے تمام طویل زمانے سمٹ کر مجبوراً صرف اس دُعا میں جذب ہوجاتے ہیں کہ "اے معبود! مجھے ایک تندرست حیوان بنا دے" ـــ لیکن یہاں ہم گوشت وپوست کے اس ظلم وتشدد سے محفوظ ہیں کیونکہ یہاں آکر ہم کسی طرح بھی حیوان نہیں رہتے۔ یہاں تم ایک روح ہو ایک غیر انسانی مظہر ـــ ایک تصور ـــ ایک رسم ـــ لافانی ـــ لاعمر ـــ اور مختصراً یہ کہ "لاجسم" ـــ یہاں نہ سماجی مسایل ہیں ـــ نہ سیاسی مسایل ـــ نہ مذہبی مسایل ـــ اور شاید سب سے زیادہ مسرور کن بات یہ ہے کہ یہاں "مسایلِ صحت" کا بھی کوئی وجود نہیں ـــ یہاں ظاہری شکل وصورت کو حُسن کہا جاتا ہے ـــ جذبات کو محبت ـــ احساسات کو زندگی ـــ وجدان کو شجاعت ـــ حوصلوں کو نیکی ـــ بالکل اسی طرح جیسے زمین کی دُنیا میں کہا جاتا تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہاں تمہاری تردید ومخالفت کرنے والے ٹھوس حقایق موجود نہیں۔ تمہاری ظاہر داریوں اور حقیقی ضروریات کے درمیان کوئی ستم ظریفانہ تضاد نہیں ـــ کوئی طربیہ انسانی سوانگ نہیں ـــ کچھ بھی نہیں صرف ایک ابدی رومان، ایک ہمہ گیر جذباتی ڈرامہ ـــ جیسا کہ ہمارے ایک جرمن شاعر نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے "یہاں شاعرانہ اہمال عین عقل ہے ـــ اور ایک "ابدی نسائیت" ہمیں ہمیشہ بلندیوں کی طرف آگے ـــ اور آگے ـــ کھینچتی چلی جاتی ہے" کچھ اس طرح کہ ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے ـــ کیا تم ان تمام باتوں کے باوجود اس مقام کو چھوڑنا چاہتی ہو؟

سارہ ـــ لیکن اگر جہنم واقعی اس قدر حسین ہے تو جنت غالباً اس سے زیادہ شاندار ہوگی!

(ابلیس۔ مجسمہ اور فرزان سب کے سب ایک ساتھ احتجاج کرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد شرمندہ ہوکر خاموش ہوجاتے ہیں)

فرزان ـــ معافی چاہتا ہوں

ابلیس ـــ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تمھاری گفتگو میں دخل تو میں نے دیا تھا

مجسمہ ـــ تم کچھ کہنے والے تھے

فرزان ـــ آپ سب اصحاب کے بعد

ابلیس ـــ (فرزان سے) تم نے میری مملکتِ جہنم کے اوصاف پر اس قدر فصیح و دلکش گفتگو کی ہے کہ میں اس دوسری آبادی یعنی جنت کے نقایص پر بھی ایسی ہی غیر جانبدارانہ روشنی ڈالنے کا کام تمھارے ہی سپرد کرتا ہوں

فرزان ـــ میری تخیلی تصویر کے مطابق جنت ایک ایسا مقام ہے جہاں ہمیں کھیلنے اور نمایش کے سوا نگ بھرنے کے بجائے زندہ رہنا اور کام کرنا ہوتا ہے۔ وہاں ہم اشیاء کی صورت کو نہیں بلکہ اصلیت کو دیکھتے ہیں۔ وہاں ظاہری شان و شوکت اور چمک دمک کے علاوہ کوئی اور چیز نظر انداز نہیں کی جاتی۔ اور وہاں استقلال اور خطر پسندی ہی میں ہماری عظمت و شوکت مضمر ہے۔ اگر یہاں جہنم میں اور سطح ارض پر ڈرامے کھیلے جاتے ہیں اور تمام دنیا کو ایک اسٹیج قرار دیا جاتا ہے تو جنت کی بابت ہم کم از کم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک منظر ہے پسِ پردہ۔ لیکن جنت کی کیفیت استعارہ کی مدد سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں ابھی کچھ دیر بعد وہاں چلا جاؤں گا کیونکہ مجھے امید ہے کہ وہاں پہونچ کر میں مسرت کے ذلیل و مضمحل کن فریب و دروغ سے محفوظ ہو جاؤں گا اور اپنی ابدیت کو غور و فکر کے مشغلہ میں صرف کر سکونگا۔

مجسمہ ـــ توبہ!

فرزان ـــ کپتان صاحب! میں تمھاری نفرت کو مجرم نہیں سمجھتا۔ ایک اندھے آدمی کے واسطے نگار خانہ ایک بے کیف جگہ ہے۔ جس طرح تم حسن و مسرت جیسے سرابوں کے تصور سے لذت گیر ہوتے ہو اسی طرح میں بھی اس کے فکر و خیال سے کسب کیف کروں گا جو مجھے تمام چیزوں سے زیادہ دلکش و دلچسپ محسوس ہوتا ہے ... یعنی "زندگی" ـــ وہ قوت جو خود اپنی حقیقت پر غور و فکر کرنے کے لئے ہمیشہ بلند تر ذہنی و فکری قدرت کے حصول کی جد و جہد کرتی رہتی ہے۔ تمھارے خیال میں میرے اس دماغ کو کس لئے بنایا گیا ہے؟ ـ کچھ نہ کچھ کرنے کی ضرورت کے لئے نہیں بلکہ جو کچھ میں کرتا ہوں اسے جاننے سمجھنے کے واسطے ـــ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو میں زندہ رہنے کی اندھی کوششوں میں خود کو ہلاک کر دوں

مجسمہ ـــ اگر صرف میرا بس چلتا تو تم شمشیر زنی کی اندھی کوشش میں خود کو کبھی کا ہلاک کر چکے ہوتے میرے دوست!

فرزان ـــ گستاخ مسخرے! صبح سے پیشتر ہی تیری ہنسی ایک دہشت ناک کوفت میں تبدیل ہو جائے گی

مجسمہ ـــ ہا ہا ـــ کیا تم بھول گئے کہ جب یہی الفاظ میں تمھیں دنیا میں اپنی سنگین چوکی پر کھڑا ہو کر سناتا تھا تو تم کس درجہ خایف ہو جاتے تھے؟ یہ الفاظ میرے سازسے جدا ہو کر کچھ بے معنی محسوس ہوتے ہیں

فرزان ـــ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ نغمہ ساز کے ساتھ ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتا ہے

سارہ ـــ اُف؟ ـ ان لغو مزاحیہ باتوں سے گفتگو میں خلل نہ ڈالو ـــ ہاں فرزان یہ بتاؤ کہ کیا جنت میں فکر و غور کے علاوہ اور کچھ نہیں؟

فرزان ـــ مجھے اس کے علاوہ جنت میں اور کسی مسرت کی تلاش نہیں ـــ لیکن وہاں ایک اہم کام بھی ہے اور وہ یہ کہ "زندگی" کو اسکی جد و جہد میں امداد دی جائے۔ ذرا غور کرو کہ "زندگی" اپنی لاعلمی اور بے بصری کے عالم میں کس کس طرح خود کو ضایع کرتی رہتی ہے۔ کس قدر دشواریاں خود اپنی راہ میں پیدا کر لیتی ہے اور خود اپنے وجود کو ہلاک کر دیتی ہے۔ زندگی کی یہ بے پناہ قوت محتاج ہے ایک دماغ کی تاکہ لاعلمی کی حالت میں یہ خود اپنی رفتار کی مزاحمت نہ کرنے لگے۔ شاعر کہتے ہیں "انسان کس قدر زبردست شاہکار ہے" ـــ بیشک! ـــ مگر اسی قدر غلط کار بھی ہے وہ! ـــ انسان زندگی کی قوتوں کا وہ اعلیٰ اور اعجاز انگیز نظام ہے جسے زندگی آج تک حاصل کر سکی ہے۔ زندہ چیزوں میں سب سے زیادہ شدید طور پر زندہ ـــ ذی حیات منظم اجسام میں سب سے زیادہ صاحب وقوف و شعور ـــ لیکن ان تمام حقایق کے

کے باوجود کس قدر ناکارہ و پست ہے اس کا دماغ!!۔۔۔ اس کی حماقت کو ان حقایق نے کمینہ و بیرحم بنا دیا ہے جو اس نے محنت و افلاس میں بے حجاب دیکھے ہیں۔ اس کی قوت تخئیل نے عزم کر لیا ہے کہ ان حقایق کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ بھوکوں مرجانا گوارا کرے گی۔ ان کو اپنی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے سراب در سراب پیدا کرتی چلی جائے گی۔۔۔ اور اس طرح خود کو ایک "اعلیٰ ذکاوت" کہہ کر پکارے گی!۔۔۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ "حماقت" اور "قوت تخئیل" اپنے اپنے عیوب سے ایک دوسرے کو متہم کرتی ہیں۔۔۔ "حماقت" کہتی ہے کہ "تخئیل" حماقت ہے اور "تخئیل" کا دعویٰ ہے کہ "حماقت" جہل ہے۔۔۔ حالانکہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ "حماقت" تمام علم پر قابض ہو گئی ہے اور "تخئیل" تمام ذہانت پر

ابلیس ۔۔۔ اور اس طرح ان دونوں نے ملکر ایک عجیب مضحکہ خیز صورت حالات پیدا کر دی ہے۔ جب میں فاسٹ کے اُس "خصوصی معاملہ" کے بندوبست میں مصروف تھا تو کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ انسان کی عقل و خرد نے اگر اب تک اس کے لئے کچھ کیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اُسے وحشی درندوں سے زیادہ وحشی بنا دیا ہے۔ ایک شاندار صحت مند جسم ایک سو بیمار و مغرور فلسفیوں کے دماغوں کے برابر ہے

فرزان ۔۔۔ یہ امر تم فراموش کر رہے ہو کہ بے دماغ جسمانی شان و شوکت کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ ایسے بہت سے حیوانات جو دماغ کے علاوہ باقی ہر لحاظ سے انسان سے بے انتہا بڑے تھے عالم وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔۔۔ زمین پر اس قسم کے مہیب حیوانات رہ چکے ہیں جن کا ایک قدم بیس میل کا ہوتا تھا یا جن کے بادل جیسے پروں سے دن کی روشنی غائب ہو جاتی تھی۔۔۔ لیکن آج وہ سب کہاں ہیں؟۔۔۔ عجائب خانوں میں اُن کے چند آثار باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی اس قدر کمیاب و نامکمل کہ ان کی ایک چھوٹی سی ہڈی یا ایک دانت کی قیمت ایک ہزار سپاہیوں کی زندگی سے بھی زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ حیوانات زندہ تھے اور زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن دماغ سے محروم ہونے کے باعث وہ نہ سمجھ سکے کہ ، مقصد کی تکمیل کیسے کریں اور اس لئے خود کو تباہ کر دیا

ابلیس ۔۔۔ اور کیا انسان اپنے دماغی پندار کے باوجود خود کو کچھ کم تباہ کر رہا ہے؟۔ کیا تم نے حال ہی میں زمین کے نشیب و فراز میں گشت لگایا ہے؟۔۔۔ میں نے ایسا کیا ہے اور انسان کی تمام حیرتناک ایجادات کا معائنہ کر چکا ہوں۔ اس لئے میں تمھیں بتاتا ہوں کہ زندگی کے سلسلہ میں انسان کچھ بھی ایجاد نہیں کرتا البتہ موت کے طریقے اختراع کرنے میں وہ خود فطرت سے آگے بڑھ جاتا ہے اور اپنے کیمیاوی علوم اور مشینوں کے ذریعہ ایسا قتل عام کر ڈالتا ہے جو مہلک وبائیں اور قحط متحدہ طور پر بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے آج دنیا میں جو کسان ملتا ہے وہ آج بھی بالکل وہی کھاتا پیتا ہے جو دس ہزار سال پیشتر کے انسان کھاتے پیتے تھے۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے وہ ایک ہزار صدیوں میں بھی اتنا نہیں بدلا جتنا کہ ایک بلند مرتبہ خاتون کے لباس کی وضع دس بارہ ہفتوں میں بدل سکتی ہے۔ لیکن جب بھی انسان قتل و غارت کے لئے اُٹھتا ہے تو اپنے آبا و اجداد کے قدیم نیزہ و تیر اور تبر و کمان کو اپنے بہت پیچھے چھوڑ کر ایک ایسی مشین اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیتا ہے جو اس کی اُنگلی کے صرف ایک اشارہ پر تمام عنصری قوتوں کی مہلک بوچھار شروع کر دیتی ہے فنون امن سے انسان قطعی ناواقف ہے۔ میں نے اس کے سوتی کارخانے وغیرہ دیکھے ہیں۔ ان کی مشینیں ایسی ہیں کہ اگر ایک کتے کو غذا کے بجائے روپیہ کی بھوک ہوتی تو وہ حریص کتا بھی ان کو ایجاد کر سکتا تھا۔ میں انسان کی بھدی ٹائپ کی مشینوں۔ شور کرنیوالی گاڑیوں اور تھکا دینے والی سائیکلوں سے خوب واقف ہوں۔ ان سب کی حیثیت مشین گن اور سطح بحر کے نیچے چلنے والی تارپیڈو کشتی کے مقابلہ میں محض ایک کھلونے کی سی ہے۔ انسان کی صنعتی جد و جہد میں اس کی حرص و کاہلی کے علاوہ اور کوئی جذبہ کارفرما نہیں اُس کا دل تو اسلحہ میں ہے۔ "زندگی" کی یہ حیرتناک قوت جس پر تم کو اس درجہ غرور و ناز ہے دراصل "موت" کی قوت ہے۔۔۔ انسان اپنی طاقت کو تباہ کاری کے پیمانے سے ناپتا ہے۔۔۔ اس کا مذہب کیا ہے؟۔۔۔ مجھ سے نفرت کرنے کا ایک عذرِ لنگ!۔۔۔ اس کا قانون کیا ہے؟۔۔۔ تمھیں تختۂ دار پر لٹکانے کا ایک بہانہ!۔۔۔ اس کا اخلاق کیا ہے؟۔۔۔ جھوٹی تہذیب!۔۔۔ پیدا کرنے کی محنت کے بغیر کھانے کا ایک بہانہ!۔۔۔ اس کا فن مصوری کیا ہے؟۔۔۔ قتل و غارت گری کی تصاویر پر حریصانہ نظریں

ڈالنے کا ایک عذر — اس کی سیاسیات کیا ہیں؟ کسی جابر حکمراں کی پرستش صرف اس لئے کہ وہ ہلاک کر سکتا ہے — یا پھر پارلیمنٹ کے ایوانوں میں ایک "جنگِ خروس" !— ابھی کچھ عرصہ ہوا میں نے اپنی ایک شام انسان کی ایک مشہور مجلس مقننہ میں بسر کی اور وزراء کو اعتراضات و سوالات کے جواب دیتے ہوئے سنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باورچی خانہ کی پتیلیاں ایک دوسرے کی سیاہی پر تقریریں کر رہی ہیں۔ جب میں وہاں سے واپس ہوا تو میں نے دروازے پر یہ قدیم مقولہ لکھ دیا — "نہ سوال کرو گے نہ جواب میں جھوٹ پاؤ گے"۔ میں نے چند پیسوں میں ایک عام رسالہ خریدا اور اسے ایسے نوجوانوں کی تصاویر سے بھرا ہوا پایا جو ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا ایک آدمی مر رہا تھا — وہ لندن کے ایک کارخانہ کا مزدور تھا اور سات بچوں کا باپ — اس نے ورثہ میں سترہ پونڈ چھوڑے۔ اس کی بیوی نے یہ پوری رقم تجہیز و تکفین پر خرچ کر ڈالی اور اگلے دن اپنے بچوں کو ساتھ لیکر کارخانے پہونچ گئی۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر سات پنس بھی صرف نہ کر سکی اور قانون نے اسے اس امر پر مجبور کیا کہ بچوں کی تعلیم خیرات و چندہ سے کی جائے — لیکن "موت" کے لئے اس نے سب کچھ خرچ کر ڈالا — موت کے تصور ہی سے انسانوں کی تخئیل جگمگا اُٹھتی ہے اور انکی قوتوں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ موت سے وہ محبت کرتے ہیں اور موت جتنی زیادہ بھیانک ہوتی ہے اتنا ہی وہ اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جہنم اُنکے فہم و ادراک سے بہت بلند ہے۔ اس کا تصور وہ صرف ان دو انسانوں کے بیانات سے کرتے ہیں جو اپنی حماقت میں لاثانی گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک اطالوی تھا اور دوسرا انگریز — اطالوی احمق نے جہنم کو ایک ایسا مقام بتلایا ہے جو کیچڑ۔ غلاظت۔ آگ اور زہریلے سانپوں سے معمور ہے — یعنی سراسر عقوبت و عذاب — ..... انگریز نے میرے متعلق یہ بتلایا ہے کہ مجھے تیغ و تفنگ کے ذریعہ فردوس سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ آج تک ہر برطانوی باشندہ یہی یقین رکھتا ہے کہ یہ پورا احمقانہ افسانہ انجیل میں موجود ہے۔ اُس نے میرے متعلق اور کیا کیا کہا یہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ ساری داستان ایک ایسی طویل نظم میں ہے جس کی وسعتوں کو نہ میں آج تک عبور کر سکا اور نہ میرے علاوہ کوئی اور — بہرحال انسان کا شوق تباہکاری ہر جگہ اور زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ ادب کی اعلیٰ ترین شکل، خزینۂ تمثیل قرار دی گئی ہے یعنی ایک ایسی تمثیل جس میں ہر ایک کردار قتل کر دیا جاتا ہے۔ قدیم تاریخی حالات میں تم نے زلزلوں اور مہلک وباؤں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی اور تمھیں بتایا گیا ہوگا کہ یہ چیزیں خدا کی قدرت و جبروت کی مظہر اور انسان کی بے بضاعتی اور ہیچ ہونے کی دلیل ہیں۔ آجکل تاریخی تصانیف لڑائیوں کی تصویریں کھینچتی ہیں۔ جنگ میں انسانوں کی دو جماعتیں ایک دوسرے پر گولیوں اور پھٹنے والے گولوں کی بوچھار کرتی ہیں یہاں تک کہ ایک جماعت فرار اختیار کرتی ہے اور دوسری جماعت گھوڑے پر سوار ہو کر مفرورین کا تعاقب کرتی ہے اور اسی حالت میں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے — اس کے بعد تاریخ بتاتی ہے کہ ان چیزوں سے سلطنتوں کی قدرت و جبروت اور مفتوحین کی بے بضاعتی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی ہی لڑائیوں پر لوگ فرط مسرت سے دیوانہ وار سڑکوں پر چلاتے پھرتے ہیں اور اپنی حکومتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ کروروں روپیہ اس قتل و غارت گری پر صرف کیا جائے، حالانکہ انتہائی طاقتور وزراء کی بھی اتنی ہمت کبھی نہیں ہوتی کہ اس افلاس و بیماری کے رفع کرنے کے لئے ایک پیسہ بھی زیادہ خرچ کر دیں جس کے درمیان سے وہ خود روزانہ گزرتے رہتے ہیں۔ میں تمھیں ہزاروں مثالیں دے سکتا ہوں۔ وہ سب اسی نتیجہ پر پہونچتی ہیں — زمین پر جو طاقت حکمراں ہے وہ "زندگی" کی قوت نہیں بلکہ موت کی قوت ہے — اور وہ باطنی ضرورت جس نے "زندگی" کو اس کوشش کی ہمت دلائی کہ خود کو انسانی مخلوق کی شکل میں منظم کرے کوئی بلند تر زندگی حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ تباہ کاری کا ایک زیادہ کارگر آلہ مطلوب تھا — طاعون۔ قحط۔ زلزلہ۔ طوفان ان سب کے اثرات عمل بہت منتشر اور تنگ تھے — شیر اور گھڑیال کی بھوک بہت جلد فرو ہو جاتی تھی اور یہ جانور کافی سنگدل بھی نہ تھے — ضرورت تو کسی ایسی چیز کی تھی جو ان سے زیادہ مستقل۔ زیادہ بے رحم اور زیادہ عقل و فراست سے تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو — اور وہ چیز تھا "انسان" !— تباہ کاریوں کا موجد — تختۂ دار اور تصاص کی "برقی کرسی" کا صناع — تیغ و تفنگ اور مسموم گیس کا خالق — خصوصاً انصاف۔ فرض۔ حب وطن اور اُن تمام عقاید کا بانی جن کے ذریعہ وہ لوگ بھی جن کو مہر و لطف کی ہوشمندی نصیب ہے انتہائی تباہ کار آلات سے زیادہ تباہ کار بن جانے پر مایل کئے جا سکتے ہیں۔

(باقی)

مسعود جاوید

فنِ ڈراما نویسی

(بہ سلسلۂ ماسبق)

کردار نگاری اب ہم ڈراما کے ایک اور اہم جزو کردار نگاری کا مطالعہ کریں گے۔ کیونکہ کردار نگاری ہی سے ایک ڈراما نویس اپنے ڈراما کو زندۂ جاوید بنا سکتا ہے۔ اور کردار نگاری ہی کے ذریعہ ڈراما کی افادی جمالیاتی اور فنکارانہ قدروں کا تعین کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز کردار نگاری میں یہ پیشِ نظر ہوتی ہے کہ ڈراما کے کردار کیا عام انسانوں سے مشابہ نہیں یا مافوق البشر ہیں جن کا ہم نے اپنی روزانہ اور عام زندگی میں کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ ایسی ہستیاں جن سے کبھی ہمارا واسطہ اور تعلق نہ رہا ہو ہماری توجہ کو کبھی اپنی جانب منعطف نہیں کرا سکتیں بلکہ اکثر ہمیں اکتا دینے والی ہوتے ہیں اس لئے ڈراما نویس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ڈرامہ کے کرداروں کے انتخاب میں ایسے لوگوں کو رکھے جو عام انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈراما کے کرداروں کو ایسی جگہ سے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں جو ہمارے تجربات اور مشاہدات سے بالاتر ہوں — یہاں ایک چیز ہمیں ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ڈراما کی کردار نگاری اور ناول کی کردار نگاری میں فرق ہے۔ ناول نگار کو کردار نگاری میں جو آسانیاں حاصل ہیں وہ ڈراما نویس کو نہیں۔ ناول نگار اپنے کرداروں کو براہ راست پیش کرتا ہے۔ ان کے اوپر اپنی رائے دے سکتا ہے اور ان کے جذبات و احساسات کو بیان کر سکتا ہے لیکن ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا نہ تو وہ اپنے کرداروں پر کوئی رائے دے سکتا ہے اور نہ اپنے طور پر ناظر یا قاری کو ان کے متعلق کسی قسم کی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ اس لئے عام طور پر کسی ناول کے کرداروں کے مقابلہ میں ڈراما کے کردار زیادہ کامیاب اور زندہ جاوید ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں نفسیات کا مطالعہ ادب کا ایک اہم جزو بن گیا ہے جو ناول نگار اور ڈراما نویس کے امتحان کی کسوٹی ہے۔ اس کسوٹی پر ناول نگار تو آسانی اور کامیابی سے گزر جاتا ہے مگر جس نے ڈراما نویس کے لئے یہ دقتیں پیدا کر دی ہیں کہ وہ کس طرح ایک محدود دایرہ میں رہکر ان حالات اور جذبات کو ظاہر کر سکتا ہے۔ پھر انسانی جذبات اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ان کو فی الحال کسی سائنس کی مدد سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ کیونکہ ایک ہی واقعہ کے اثرات مختلف لوگوں پر مختلف ہوتے ہیں اس سے ڈراما نویس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما نویس اس امتحان سے کامیابی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔ مگر ابھی ڈراما نویس کے ہاتھ میں پلاٹ اور پلاٹ میں متوازیت اور تقابل کا بڑا ہتھیار ہوتا ہے جس سے ایک واقعہ کے مختلف اثرات اور ان کے مختلف ردِ عمل کو ظاہر کیا جا سکتا ہے اور مختلف کرداروں کی نفسیات کو پیش کیا جا سکتا ہے ——— لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ڈراما نویس نے فطرتِ انسان کا گہرا مطالعہ کیا ہو وہ ان کے محرکات کو سمجھتا ہو جن سے انسانی جذبات حرکت پذیر ہوتے ہیں

جیسا کہ پلاٹ کی بحث میں ہم نے بتایا تھا کہ ڈراما کے لئے اختصار بہت ضروری ہے یہی اختصار کردار نگاری میں بھی لازمی ہے۔ ایک ناول نگار تو جس قدر چاہے اپنے کرداروں کو پھیلا سکتا ہے مگر ڈراما نویس ایسا نہیں کر سکتا اور اختصار کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کو قدم قدم پر اختصار سے کام لینا پڑتا ہے ایک محدود دائرہ میں وہ اپنے کرداروں کی اندرونی و بیرونی کشمکش کا اظہار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسکے سامنے کہانی کو آگے بڑھانے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس لئے ڈراما نویس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اختصار کا دامن نہ چھوڑے اور ممکن طریقے سے اختصار سے کام لے بعض ڈراما نویس یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے ڈرامے کو جس قدر پھیلائیں گے اسی قدر ان کے کردار نمایاں ہوں گے اور اس طرح مرکزی خیال کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی، غلط ہے۔ کسی کردار اور پلاٹ کی بڑائی اس کے اختصار میں ہے نہ کہ اس کی طوالت میں۔

کردار نگاری میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ڈراما نویس اپنی توجہ اس خاص نکتہ اور کردار کی اس خاص خصوصیت پر مرکوز کر دے۔ جس کو وہ خصوصیت کے ساتھ نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ اس سے اختصار کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور وہ ان تمام غیر ضروری تفصیلات سے بچ جائے گا جو اختصار کی راہ میں حایل ہیں پروفیسر ٹول مین لکھتے ہیں کہ " ڈرامہ میں ہیرو یا کسی خاص کردار کی اس خصوصیت کو نمایاں کرنا لازم ہے جو کہانی کے بہاؤ میں مدد دے، لیکن کسی کردار کو نمایاں کرنے کے لئے ایسے واقعات داخل نہیں کرنا چاہئے جو کردار کی شخصیت سے علٰحدہ ہیں، جو ڈرامہ پر براہ راست کسی پہلو سے اثر نہیں ڈالتے اور نہ کہانی جس مرکزی خیال پر گردش کر رہی ہے اس سے ان کا واسطہ اور تعلق ہے۔ اگر اس طرح کردار نگاری میں غیر ضروری خصوصیات کو اجاگر کیا گیا تو اس کو ہم ناواجب کردار نگاری کہیں گے۔

ڈراما میں اس کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ ڈراما نویس خود کو ڈراما کی شخصیتوں سے قطعی علٰحدہ رکھے۔ یہی چیز ڈراما اور ناول کی کردار نگاری میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ناول نگار خود کو کرداروں سے بے تعلق نہیں کر سکتا۔ وہ ان کے احساسات و جذبات پر رائے دیتا ہے اور ان کی اندرونی کشمکش اور پوشیدہ محرکات کو بیان کرتا ہے ان کی اچھی اور بری خصوصیات پر اظہار خیال کرتا ہے مگر ڈراما نویس صرف ایک ناظر ہوتا ہے جو دور کھڑے ہو کر ان کا مطالعہ کرتا ہے اور کیمرہ کی طرح ہر اس چیز کو جو اس کے سامنے آتی ہے دوسروں پر ظاہر کر دیتا ہے اور خود بے تعلق رہتا ہے۔ اس سے ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ ڈراما نویس اپنے خیالات اور نظریات کو ڈراما کے ذریعہ پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ہر ڈرامہ میں مصنف کے نظریات اور رجحانات اکثر گوشوں سے جھانکتے نظر آتے ہیں ـــــ ڈراما نویس کی کرداروں سے بے تعلقی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غایت اور مرکزی خیال سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور نظریات ڈراما ہی کے کرداروں کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی پلاٹ کے لئے کردار پیدا کئے جاتے ہیں، غلط ہے بلکہ کرداروں کی کشمکش، ان کے اندرونی جذبات اور بیرونی ماحول سے پلاٹ خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔ یہ پلاٹ نہیں ہوتا جو کرداروں کے احساسات و جذبات کا رخ بدل دیتا ہے بلکہ یہ کردار ہوتے ہیں جو پلاٹ کا رخ بدل دیتے ہیں۔ تھیکرے نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ۔ " میں اپنے کرداروں کو کنٹرول نہیں کر سکتا میں ان کے ہاتھ میں ہوتا ہوں اور وہ جہاں چاہتے ہیں مجھے لیجاتے ہیں"۔ اس سے ظاہر ہے کہ پلاٹ اور کرداروں کے تعلق میں پلاٹ کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ کرداروں کی ہے۔

مکالمے ڈراما نویس ہر کردار کو مکالموں کے ذریعہ سے پیش کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ سے وہ کرداروں کی اندرونی کشمکش اور بیرونی مشکلات کا اظہار کرتا ہے۔ اس لئے مکالموں میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر وہ لفظ جو کسی کردار کے زبان سے نکلے اس کو کردار کی شخصیت اور فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور اس کے مکالموں کی بنیاد اسکے خیالات و جذبات پر ہونا چاہئے کیونکہ مکالموں میں ذرا سی لغزش بھی کردار کو اس کے اصل منصب سے ہٹا سکتی ہے، جو مکالمے کسی ڈراما میں بولے جائیں وہ ایسے بکھرے ہوئے دانے نہ ہوں جن کے جمع کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو بلکہ ایسے دانے ہوں کہ جب وہ جمع کئے جائیں تو سب ملکر ایک وحدت میں منسلک کئے جا سکیں۔ اس سے اول تو اختصار کا مسئلہ حل ہو جائے گا دوسرے یہ کہ ہر کردار اپنے صحیح رُوپ میں نظر آنے لگے گا اور مرکزی خیال بھی نمایاں ہو گا۔

ڈراموں میں ہم کو اکثر ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو اکثر تنہا کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار بلند آواز سے کرتے ہیں اسے خود کلامی کہتے ہیں چونکہ ڈراما میں ناول کی طرح کسی چیز پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس مشکل کے پیش نظر ڈراما میں خود کلامی کا ذریعہ اختیار کیا گیا ہے، ہر چند یہ بات غیر فطری سی ہے مگر بعض اوقات حالات کے تحت اس کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ وہ بات جو کوئی شخص سوچ رہا ہے، اس کا اظہار ناظرین پر بھی ضروری ہوتا ہے، تاہم جہاں تک ممکن ہو خود کلامی سے احتراز کرنا چاہئے۔ مکالموں کا فطری ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور برمحل ہونا بھی ضروری ہے۔ ان میں زبان پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی کردار ایسی زبان استعمال نہ کرے جو بناوٹی اور غیر فطری ہو۔

ڈراما کی اقسام (ا) المیہ (Tragedy) ٹریجڈی ڈراما کی وہ قسم ہے جو سب سے زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے جس کا اختتام ناکامی پر ہوتا ہے اور جس میں سب سے اعلیٰ کردار عام طور پر اپنی کسی کمزوری کے باعث ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔

(ب) طربیہ (Comedy) ڈراما کی یہ قسم طربیہ انداز میں اختتام پذیر ہوتی ہے جس میں زندگی کو زیادہ سنجیدہ انداز میں پیش نہیں

کیا جاتا اور جس میں قہقہے ہوتے ہیں۔

(ج) المناک طربیہ (Tragic Comedy) یہ المیہ اور طربیہ ڈراموں کا ایک اتحاد ہوتا ہے جس کا اختتام عام طور پر طربیہ انداز میں ہوتا ہے۔

(د) تاریخی (Historical or chronicle Play) ایسے ڈراموں میں اہم اور نمایاں اشخاص کی زندگیوں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں اور ان اشخاص کے ساتھ چند ایسے کردار بھی شامل کر دئے جاتے ہیں جو صرف ذہنی تخلیق ہوتے ہیں۔

(ہ) سوانگ (Farce) یہ کامیڈی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس میں سوائے قہقہوں کے اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ قہقہے عام طور پر مبالغے اور مسخرے پن سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

(و) معجزاتی اور اخلاقی (Miracle & morality) یہ ڈرامے عام طور پر گزشتہ زمانہ میں رائج تھے جس میں کسی پیغمبر یا کسی اولیا کی زندگی بیان کی جاتی تھی۔

(س) خیالی:۔ (Fantasy) اس میں ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے۔

ڈراما زندگی کی تنقید ہے

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈراما مرد اور عورتوں کی زندگی سے بحث کرتا ہے ڈراما ان کے آپس کے تعلقات انکے خیالات و محسوسات ان کے جذبات و محرکات۔ ان کی جد و جہد کی تفسیر ہے۔ زندگی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ فلسفی زندگی کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ انھوں نے زندگی کو کیا سمجھا ہے اور کیا محسوس کیا ہے اور زندگی کے متعلق ان کی کیا رائے ہے، اس پر ہزاروں کتابیں مختلف فلسفیوں کی موجود ہیں جن کو دیکھ کر ہم اس کے متعلق مختلف فلسفیوں کے خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ڈراما نگار بھی زندگی کے متعلق ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اکثر ڈراما نویس صرف زندگی کا مشاہدہ کرنے والے ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی کے متعلق سوچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اور اسی زاویۂ نگاہ سے اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ ہر ڈراما ایک خاص زمانہ اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے ایک ڈراما نویس کبھی اس ماحول اور اس زندگی کی عکاسی نہیں کرتا جس کا اس نے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ زندگی کے حقایق سے بحث کرتا ہے وہ صرف ان سچائیوں کو پیش کرتا ہے جن کا انکار نہیں۔

یہ خیال کرنا کہ ڈراما کی کہانی فرضی ہوتی ہے اس لئے اس کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں، غلط ہے، ادبی کہانیوں میں ہر چیز سچی ہوتی ہے۔ سوانا نام اور تاریخ کے۔ ڈراما نویس جو کہانی اپنے لئے منتخب کرتا ہے وہ آسمانی یا الہامی نہیں ہوتی، بلکہ ڈراما نویس کو اپنی کہانی اپنے اردگرد کے چلتے پھرتے انسانوں میں ڈھونڈنا پڑتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے افراد کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ ان افراد میں اس کے اعزہ ہوتے ہیں۔ اس کے دوست ہوتے ہیں۔ اس کے افسر ہوتے ہیں۔ ماتحت ہوتے ہیں، دوکاندار ہوتے ہیں جن سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ اس کے گھر کے ملازم ہوتے ہیں اور ہر وہ شخص ہوتا ہے جس سے اس کا تعلق ہے اور پھر انہی کی زندگی کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی ایسا گوشہ مل جاتا ہے جس سے کوئی معمولی اور غیر اہم کہانی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی بظاہر معمولی نظر آتی ہے مگر ڈراما نویس کا ذہن معمولی واقعات سے بہت اہم اجزاء تلاش کر لیتا ہے۔ ان واقعات میں تاریخی واقعات سے زیادہ سچائی ہوتی ہے کیونکہ تاریخ میں عام طور پر تعصب کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ مگر ڈراما کی کہانی کے واقعات میں اس احتمال کی گنجایش نہیں، کیونکہ ڈراما نویس انہی سچے واقعات کو بیان کرتا ہے جس کا اس نے خود مطالعہ کیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ڈراما نویس ہمیشہ اپنے کرداروں کے چناؤ میں کسی ایسے کردار کی تلاش کرتا ہے جو آئڈیل ہوتا ہے؟۔ کیا ڈراما نویس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ایک آئڈیل کردار پیش کرے۔ اس کے جوابات مختلف ہیں۔ ایک ایسا شخص جو ہر چیز میں اخلاقی قدروں کو تلاش کرتا ہے اسکا جواب اثبات میں دے گا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اخلاقی قدروں کا معیار کیا ہے۔ کیا اخلاقی قدروں سے مراد وہ اصول ہیں جو فلسفیوں نے مقرر کئے ہیں اور کیا اخلاقی قدریں جو فلسفیوں نے مقرر کی ہیں ایسے مسلم الثبوت اصول ہیں جن سے انکار کی گنجایش نہیں۔ اور کیا وہ تمام اخلاقی قدریں جن کو فلسفیوں نے معیار اخلاق قرار دیا ہے کسی ایک فرد واحد میں مکمل طور پر مل سکتی ہیں؟ ان سب سوالات کا جواب اثبات میں ملنا مشکل ہے۔ ہر شخص میں

کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ جو اس اخلاقی معیار پر پوری نہیں اترتیں جن کو فلسفیوں اور زیادہ تر مصلحین نے اخلاقی معیار قرار دیا ہے۔ اس لئے کسی ایسے کردار کی تلاش کرنا جو اخلاقی معیار کا مکمل نمونہ ہو، اول تو غلط ہے اور ایسا کردار پیش بھی کیا جائے گا تو وہ چلتا پھرتا عام انسان نہیں ہوگا بلکہ ایک تصوری اور خیالی انسان ہوگا جس سے ہر شخص اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرے گا۔ اس لئے ڈراما نویس کو ایسا کردار پیش کرنا چاہئے جو اردگرد کے عام انسانوں میں نظر آئے لیکن اس صورت میں کہ آئیڈیل انسان سے مراد وہ شخص ہوگا جس میں ایک خاص طبقہ کی خصوصیات موجود ہوں، اس کا جواب یہ ہوگا کہ ڈراما نویس کو ایسے ہی کردار پیش کرنا چاہئے جو کسی طبقہ کی نمایندگی کرتے ہوں اور ایسا کردار ملنا مشکل نہیں کیونکہ ہر طبقہ اور فرقے میں ایسے افراد مل سکتے ہیں جو مکمل طور پر اس طبقہ کی نمایندگی کر سکیں۔ ایک ایسا شخص جس کی پرورش چوروں کے ماحول میں ہوئی ہے تو وہ اس ماحول سے متاثر ہو کر چور بن جاتا ہے مگر جب اس کو اس ماحول سے متاثر ہو کر وہ چوری کی گندی عادت کو ترک کر دیتا ہے پس ثابت ہوا کہ ڈراما میں کسی ایسے انسان کی نمایندگی نہیں ہوتی جو ذہنی یا تصوری ہوتے ہیں بلکہ ایسے انسان پیش کئے جاتے ہیں جو چلتے پھرتے ہوتے ہیں اور جو عام طور پر ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں اور پھر ڈراما نویس اس طرح تنقید کرتا ہے کہ عوام کی حقیقی زندگی سامنے آجائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈراما ماحول پر بھی تنقید ہے یا نہیں، اس کا جواب صاف ہے کیونکہ انسان ماحول ہی کی پیداوار ہے اور اس کے اندر جو تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں وہ یکسر ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ پیدائش کے وقت بچہ کا کوئی کیرکٹر نہیں ہوتا لیکن بعد کو بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر اس کا کیرکٹر بنتا بگڑتا ہے۔ الغرض کوئی کردار موروثی نہیں ہوتا بلکہ اس کی تعمیر ماحول کے اثرات سے ہوتی ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ "تاریخ بظاہر زمانوں اور سلطنتوں کی روایتوں سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ لیکن دراصل وہ نام ہے نظر و تحقیق کا۔ اس گہرے علم کا جس کا تعلق واقعات کی کیفیات اور اسباب سے ہے"۔ تاریخ کی اس تعریف کو اگر ہم ڈراما پر منطبق کریں کریں تو ہم کو ڈراما کے اندر بھی وہ خصوصیات نظر آئیں گی جو تاریخ کے دائرہ عمل میں آتی ہیں، اگر تاریخ کے اس حصہ سے ہم بحث کریں جس میں سلطنتوں کی روایتوں سے تعلق ہوتا ہے تو ہم کو ایسے تاریخی ڈرامے ملیں گے جن کی بنیاد کسی تاریخی واقعہ پر رکھی گئی ہے اور جس کی کہانی کسی اہم تاریخی واقعہ سے پیدا ہوئی ہے مگر چونکہ تاریخ صرف سوانح نگاری یا واقعہ نگاری نہیں ہے اس لئے اس کا دائرہ ہر دور کے معاشی، عمرانی اور مجلسی حالات تک وسیع ہے اور ڈراما ہر دور کے معاشی، عمرانی اور مجلسی حالات کے گہرے مطالعہ سے دلچسپی لیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں پروپیگنڈا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور سیاسی سماجی۔ معاشی اور عمرانی تبدیلیوں کا زیادہ تر دارومدار اسی پروپیگنڈے پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں زندگی جس قدر تیز رفتار ہے اس کے لئے اسی قدر پروپیگنڈا تیز ہونا چاہئے اور ڈراما ایسا ہی ہتھیار ہے جو اس تیز رفتار زندگی کا ہر طرح ساتھ دے سکتا ہے۔ یہاں اس بحث کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ کیا ادب سے پروپیگنڈے کا کام لیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مگر مختصر طور پر صرف اسقدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ ادب پروپیگنڈے کا ایک اہم ہتھیار ہے۔ اس زمانہ میں نہیں بلکہ یہ ہر زمانہ میں پروپیگنڈے کا فرض انجام دیتا رہا ہے۔ خود ہمارے ادب میں کیا اس نے پروپیگنڈے کا کام نہیں کیا۔ آجکل پروپیگنڈا ایک ایسی عالمگیر حیثیت حاصل کر چکا ہے کہ قدم قدم پر پروپیگنڈے کی مدد درکار ہوتی ہے حکومتیں اپنا پروپیگنڈا کرتی ہیں۔ بڑی بڑی تجارتی فرموں سے لیکر معمولی سے معمولی دوا فروش پروپیگنڈے کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے بھی پروپیگنڈے میں اپنا اثر رکھتے ہیں۔ اسی لئے اس کو موثر بنانے کے لئے پروپیگنڈے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے کورس میں پروپیگنڈے کی تعلیم کو داخل کر دیا گیا ہے انسان فطرتاً ایسے واقعات سے متاثر ہوتا ہے جو اس کے سامنے واقع ہوں۔ اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ تیرا دوست مر گیا تو وہ اس سے اس قدر متاثر نہیں ہوگا جتنا کہ اپنے دوست کو نظروں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھ کر۔ چونکہ ڈراما اور فلم واقعات کو اصل کے طور پر پیش کرتا ہے اس لئے وہ موثر ہوتے ہیں۔ تاریخ میں اکبر کی زندگی کے حالات پڑھکر اسقدر ذہن نشین نہیں ہو سکتے جتنے کہ ان کو پردہ فلم یا اسٹیج پر ڈراما کے روپ میں دیکھ کر۔ کسی چیز کی اچھائی اور برائی کا اندازہ صرف کانوں سے سنکر نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ اس کا تجربہ نہ کیا جائے۔ فرض کیجئے کہ کسی صابون کی یہ اچھائی ہے کہ وہ کپڑے بہت صاف دھوتا ہے پھر اگر کسی شخص سے اب یہ کہا جائے کہ فلاں صابن کی یہ خصوصیت ہے تو کوئی بھی سننے والا اس پر کچھ زیادہ دھیان نہ دے گا مگر اگر اس کو یہ نہ بتلایا جائے کہ کونسا صابن کپڑے اچھے اور صاف

دھوتا ہے بلکہ خاموشی سے پردہ فلم یا اسٹیج پر یہ بتلا دیا جائے کہ دو مختلف اشخاص دو مختلف صابنوں سے اپنے کپڑے صاف کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص باوجود سخت محنت اور کوشش کے اپنے کپڑے صاف اور اجلے نہ کر سکا جبکہ دوسرا شخص جو اس مخصوص صابن سے اپنے کپڑے صاف کر رہا ہے انھیں اُجلے اور صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا تو دیکھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات اُتر جائے گی۔ یہی حال خیالات اور عقاید کا ہے۔ ڈراما خیالات اور عقاید کے پرچار کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اس کے ذریعہ جب خیالات اور عقاید پیش کئے جاتے ہیں تو وہ بہت زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں اس لئے اس دور میں ڈراموں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے زمانہ میں ڈرامہ صرف تفریح کا مشغلہ سمجھا جاتا تھا اب وہ ایک اہم فرض انجام دینے لگا ہے۔ اس دور میں جبکہ عقاید کے اختلافات سے دوچار ہوتا ہے تو ڈرامہ میں تو اس کے ذہن کے لئے ایک محرک مل جاتا ہے اور پھر اس کے لئے جنسی دماغ کو ایک راستہ مل جاتا ہے جو اسے تاریکیوں میں نہیں بھٹکنے دیتا۔

ابراہیم یوسف

خریدارانِ "نگار" کے لئے

ایک نہایت ضروری اعلان

۱۔ "نگار" کا سالانہ چندہ معہ سالنامہ کے (جس میں جنوری، فروری کے پرچے شامل ہوتے ہیں) آٹھ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن جو حضرات سالنامہ لینا نہ چاہیں گے اور سال میں صرف دس پرچوں پر قناعت کرینگے ان کے لئے چندہ بدستور چھ روپیہ رہے گا

۲۔ اگر آپ سالنامہ لینا نہیں چاہتے تو ازراہِ کرم جلد از جلد مطلع فرمائیے، کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے سالنامہ کی کاپیاں زاید نہیں چھاپی جائیں گی

۳۔ اگر آپ نے اطلاع نہیں دی تو سمجھا جائے گا کہ آپ سالنامہ لینا چاہتے ہیں اور وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے میں روانہ ہوگا اگر آپ کا چندہ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ختم ہوتا ہے — ورنہ دو روپیہ چھ آنے کا وی، پی جائے گا

۴۔ جو حضرات سالنامہ لینا پسند نہ فرماویں گے اور اس کی اطلاع ہم کو دیدیں گے ان کی خدمت میں دسمبر ۱۹۵۱ء کے پرچے کے بعد مارچ ۱۹۵۲ء کا "نگار" بھیجا جائے گا

۵۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ دس مہینے کے سال کا چندہ چھ روپیہ ہے اور پورے بارہ مہینے کے سال کا چندہ آٹھ روپیہ ہے۔

مینجر نگار

عشق

جھیل ایک یاقوت کبود کی طرح نیلگوں آسمان کے نیچے چمک رہی تھی اس کا چہرہ شکن سے بالکل صاف تھا۔ گویا وہ ایک خوبصورت عورت تھی ساکت و مطمئن، جو سو رہی ہو اور کوئی دلکش خواب دیکھ رہی ہو

یہ دوشیزۂ صحرا تھی جس کے چاروں طرف خودرو پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا، گویا قدرت نے اس کے لئے حجلۂ گل آراستہ کیا ہے اور وہ اس کے اندر آرام سے سو رہی ہے

ہلکی ہلکی بادِ نسیم چل رہی تھی، گویا اسے نیند سے جگا رہی تھی تاکہ وہ درخت بلوط سے کچھ باتیں کرے جو خاموش جھیل کے اس خواب شیریں سے لطف اٹھا رہا تھا — آخر کار بلوط کے دل میں بھی ہیجان پیدا ہوا، جھیل کی طرف سر جھکا کر اپنا چہرہ اس کے بلوریں سینہ میں دیکھا اور کیفیت عشق اسکے اندر پیدا ہونے لگی وہ سوچنے لگا کہ جھیل بھی عشق و محبت کے کتنے گہرے اور خوفناک راز اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے اور اس کے خوبصورت ساحل سے شیفتگانِ محبت نے کتنی قربانیاں پیش کی ہیں

زمانہ بہار کا تھا اور فضا بوئے محبت سے لبریز اس لئے بلوط میں بھی جھیل سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کا جذبہ قوی ہو گیا

جھیل کی عمر شاید ہزار سال سے بھی زیادہ تھی لیکن اس راز سے اس کے سوا کوئی واقف نہ تھا۔ بلوط کی عمر تین سو سال کی تھی اور صحرا کے تمام درخت اس سے واقف تھے

ان دونوں کی شناسائی گرمی کی ایک دوپہر سے شروع ہوئی تھی جب ایک طرف بلوط اپنا ٹھنڈا سایہ جھیل پر ڈال کر اس کو تمازت آفتاب سے بچا رہا تھا اور دوسری طرف جھیل اپنے پانی سے اس کے ریشوں کی آبیاری کر رہی تھی

بلوط نے آہستہ آہستہ اپنا سر جھکایا اور بولا :۔ "اے جھیل، تیرا وجود بھی کتنا مبارک وجود ہے"

جھیل نے جواب دیا:۔ "نہیں بلوط تو زیادہ قابلِ تعریف ہے کیونکہ چڑیاں تیرے دامن میں گھونسلہ بناتی ہیں، اور تیری شاخوں پر بیٹھ کر چہچہایا کرتی ہیں، مجھے یہ سعادت کہاں نصیب!

بلوط — "کیا تیری آغوش میں رنگین مچھلیاں پناہ نہیں لیتیں، یہ بھی تو خدائے محبت ہی کی بیٹیاں ہیں"

جھیل — "یہ صحیح ہے لیکن اُن میں چڑیوں کا سا گرم خون کہاں، چڑیوں کے عشق میں جوش و خروش ہے اور مچھلیوں کا جذبۂ محبت سرد و خاموش ہے جو بہت جلد خستگی پیدا کر دیتا ہے"

بلوط — "مگر تیرے ساحل پر تو آدم زاد محبت کرنے والے آکر بیٹھتے ہیں، راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ کیسی کیسی خوبصورت لڑکیاں اپنے جسم کو برہنہ کر کے تیری آغوش میں کھیلتی ہیں۔ ان کا خون تو سرد نہیں؟"

جھیل — "لیکن یہ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ بھی میری ہی طرح عورت ہیں، مرد میرے پانی سے ڈرتے ہیں اور میری آغوش سے دور رہتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ لڑکیاں بہت بے ادب ہیں، میرے صاف و شفاف پانی کو مٹی سے گندہ کر دیتی ہیں، میری مچھلیوں کو پریشان کرتی ہیں اور میرے چہرے کو شکنوں سے بھر دیتی ہیں

جھیل و بلوط دونوں دفعتاً خاموش ہو گئے، کیونکہ ناگاہ انھوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان مرد ایک خوبصورت لڑکی کے کمر میں ہاتھ ڈالے خراماں

خراماں چلا آرہا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو بلوط اور جمیل خاموشی سے دیکھتے رہے لیکن عورت زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکی، اسلئے جمیل بول اٹھی:

" یہ دونوں چار سال سے ہر موسم بہار میں یہاں آتے ہیں اور گھنٹوں تیرے تنہ کا سہارا لئے ہوئے راز و نیاز عشق میں مصروف رہتے ہیں"

بلوط بولا۔" میں بھی ان دونوں کو پہچانتا ہوں، لیکن حیرت ہے کہ ان دونوں نے اب تک شادی نہیں کی"

جمیل ۔" انسان عجیب مخلوق ہے، مرد سمجھتا ہے کہ شادی کے بعد آرزؤں کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ تم بھی تو مرد ہی ہو، تم کو تو ایسا نہ کہنا چاہئے"

یہ سنکر بلوط کو غصہ آیا لیکن اس نے ضبط کیا کیونکہ تین سو سال کے بعد اس کے لئے یہ پہلا موقعہ محبت کرنے کا تھا اور وہ اسکی فضا کو خراب کرنا چاہتا تھا

یہ دونوں خاموشی سے اس جوڑے کا تماشہ دیکھنے لگے، کیونکہ تماشائے عشق بھی لطف سے خالی نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب یہ جوڑا اپنی جگہ سے اُٹھا تو جمیل نے بلوط سے کہا کہ:-

" دیکھتے ہو ان کی بدتمیزی کہ کھانے کی خالی ٹوکری کس بدتمیزی کے ساتھ انھوں نے میرے سینہ پر کھینچ ماری"

بلوط ۔" اور اِدھر بھی تو دیکھو کہ میری پوست کو انھوں نے چاقو کی نوک سے زخمی کر کے کیا کیا۔ اور میری اذیت کی کوئی پروا نہ کی"

جمیل نے دیکھا کہ" دو دل تیر سے چھدے ہوئے" اس کے تنہ پر منقوش تھے اور اس کے نیچے دونوں کے نام درج تھے

جمیل یہ دیکھ کر خاموش ہو گئی اور پھر یہ سوچکر کہ غروب کا وقت ہے، بلوط کو عشق و محبت کی کچھ داستانیں سنانا چاہئے تاکہ اس کو نیند آجائے۔ یہ سوچ کر اس نے آواز بلند سے کہا:

" بلوط، کیا تم سو رہے؟"

بلوط ۔" نہیں میں سویا نہیں، بلکہ اس انسانی جوڑے کے انجام پر غور کر رہا ہوں"

جمیل۔" تمھیں کیوں اس کی فکر ہے"

بلوط ۔" مجھے فکر اس لئے ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی لڑکیاں جب جوان ہونے کے بعد محبت کئے جانے کی خواہش اپنے اندر محسوس کرتی ہیں تو مردوں کی دلشکستگی کی بہت کم پروا کرتی ہیں"

جمیل ۔" اس میں غلطی مرد ہی کی بھی ہے کہ وہ محبت کرتے ہی عورت کا سب کچھ اس سے فوراً چھین نا چاہتے ہیں، خیر اس نوجوان کا ذکر چھوڑو۔ مجھے یاد ہے کہ جب ملکہ الزبتھ انگلستان کی فرمانروا تھی اس کے ایک چاہنے والے کو نہایت تاریک و سرد قید خانہ میں بند کر دیا گیا"

بلوط ۔" خوب کیا، کیونکہ ۔۔۔"

جمیل۔" کیونکہ کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ سنو جو کچھ اس کے بعد ہوا پہلے اس کے دل میں خنجر پیوست کیا، پھر بھاری آہنی گولے اس کے ہاتھ پاؤں میں باندھ دئے گئے اور اس کی لاش معہ اس کے خنجر کے جو اس کے دل میں پوست تھا میرے اندر پھینکدی اور دس سال تک وہ خنجر مجھے دکھ پہونچاتا رہا، اس جوان کی ہڈیاں اب بھی میرے اندر موجود ہیں۔ کیا تم جانتے ہو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اسوقت انگلستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی"

بلوط ۔" وہ کیونکر"

جمیل۔" اس طرح کہ یہ نوجوان الزبتھ کی تمام عشقبازیوں اور ہتھکھنڈوں سے واقف تھا اور اسے معلوم تھا کہ الزبتھ کے جاسوسوں نے کس طرح اسپانیا کو جنگ پر مجبور کر کے اسے شکست سے دوچار کیا"

بلوط ۔" چھوڑو ان قصوں کو، مجھے تاریخ سے دلچسپی نہیں، تم تو کچھ ایسی باتیں کرو جو موسم بہار میں دو محبت کرنے والے دلوں کو بھلی معلوم ہوں"

جمیل سمجھ گئی کہ اس وقت بلوط پر جذبۂ عشق غالب ہے اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ پھر بھی اسے اس محبت کی پایداری کا یقین نہ تھا

صبح کا وقت تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں کی خوشبو سے لدی ہوئی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بلوط نے بھی اپنی شاخوں کو بارش کے پانی سے دھو چکا تھا اور جمیل بھی ہوا کی مدد سے اپنی زلفوں میں پیچ و خم پیدا کر چکی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو لبھانے کے لئے آمادہ تھے

اسی وقت ایک نوجوان ایک خوبصورت لڑکی کو لئے ہوئے آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے پہونچا اور دونوں بلوط کے سایہ میں بیٹھ کر محبت کی سرگوشیوں میں مصروف ہوگئے۔ مرد انتہائی شیفتگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا اور لڑکی بھی حد درجہ خوشدلی کے ساتھ اس کے اعترافات محبت کو سن رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی اپنی جگہ سے اُٹھی، اپنے کپڑے اُتارے اور نہانے کا لباس پہن کر جھیل کے کنارے آئی اور پانی میں اُتری

نوجوان نے پوچھا:۔ "پانی زیادہ سرد تو نہیں ہے"

جھیل نے یہ سوال سنکر بہت پیچ و تاب کھایا اور اپنے دل میں سوچا کہ "بہار اور سردی! کیا خوب، معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ابھی تک اسرار عشق سے پوری طرح واقف نہیں ہے"۔ تاہم جھیل نے سورج کی کرن کی مدد سے اپنے پانی کی سردی کو دور کر لیا یہاں تک کہ جب لڑکی اس کے اندر داخل ہوئی تو وہ کافی گرم ہو چکا تھا

لڑکی نے اپنا قدم پانی میں رکھا تو بولی "پانی گرم ہے" اور آہستہ آہستہ کمر کمر پانی تک بڑھ گئی اور مسکرا کر نوجوان سے کہا کہ "تم بھی آجاؤ"۔ یہ کہکر لڑکی اور آگے بڑھی یہاں تک کہ جب پانی اس کے سینہ تک پہونچ گیا تو اس کا پاؤں دفعتاً پھسلا اور وہ چیخ اُٹھی کہ "مجھے بچاؤ میں ڈوب رہی ہوں"

نوجوان پیرنا نہیں جانتا تھا، لیکن بے اختیار اپنی محبوبہ کی مدد کے لئے پانی میں کود پڑا اور جب اپنی محبوبہ کے پاس پہونچا تو اس نے گردن میں ہاتھ ڈالدئے اور اسے بھی کھینچ کر پانی کی تہ تک لے گئی

یہ دیکھ کر بلوط کی رگِ حمیت کو جنبش ہوئی اور جب آخری بار مرد پانی کی سطح سے اُبھرا تو اس نے اپنی شاخیں جھکا دیں جن کو پکڑ کر وہ نوجوان اوپر آگیا اور اپنی محبوبہ کو بھی باہر لے آیا

آفتاب ڈوبنے والا تھا اور یہ انسانی جوڑا ساحل سے اُٹھکر واپس چلا گیا اور بلوط و جھیل دونوں چاندنی رات میں تنہا رہ گئے

بلوط کی شاخ سے پانی کا ایک قطرہ ٹپک کر جھیل کی آغوش میں گرا

جھیل بولی:۔ "کیا تم رو رہے ہو"

بلوط ۔ "اگر تو سنگدل نہ ہوتی تو تو بھی میری ہی طرح آنسو بہاتی۔ وہ کون ہے جو عشق کے ان دلدوز مناظر کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگا"

جھیل نے آسمان کی طرف نگاہ کی، اپنے صاف چہرہ کو چاند کے آئینہ میں دیکھا، مسکرائی اور اپنی زلفوں میں ہزارہا شکنیں ڈالکر خاموش ہوگئی

ناگاہ اسی وقت شاخ بلوط پر ایک بلبل آیا اور چہکنے لگا۔ جھیل کا دل اس کا نغمہ سنکر بھر آیا اور بلوط سے بولی:۔ "تم مجھے سنگدل سمجھتے ہو اور اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ مجھ سے زیادہ رقیق القلب کوئی اور نہیں"

بلوط نے اپنا سر جھیل کی طرف جھکا دیا۔ چاند اور زیادہ چمک اُٹھا۔ ہوا پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوگئی اور جھیل بولی کہ "میں خود ایک اشک سے زیادہ نہیں جو معلوم نہیں کس وقت ساکنان ملاء اعلیٰ کی آنکھوں سے ٹپکا تھا"

بلوط جھکا اور جھیل کو بوسہ دیکر خاموش ہوگیا

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول ۔ منیجر نگار لکھنؤ

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی اور معاشرتی مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (صہ) علاوہ محصول ۔ منیجر نگار لکھنؤ

انیس اور امیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام

(شوکت بلگرامی)

انیس یہ مشہور قصہ ہے کہ میر انیس مرحوم نے بچپن میں ایک بکری پالی تھی جس کو بہت چاہتے تھے جب وہ مری تو ان کو بہت ملال ہوا اور اُسکے مرنے پر یہ شعر کہا:-

افسوس کہ دُنیا سے سفر کر گئی بکری — آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

سنا ہے کہ جب ان کے والد کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہونہار بیٹے کو بُلا کے مکرر اس شعر کو پڑھوایا، تعریف سے دل بڑھایا اور اس خوشی میں کہ صاحبزادے نے پہلے پہل شعر کہا ہے اپنے بیگانوں میں مٹھائی تقسیم کی اور اس دھوم دھام سے انیس کی شاعری کی بسم اللہ ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس نئی روشنی کے زمانہ میں یہ باتیں محبت کا چوچلا یا بچوں کے بہلانے کا طریقہ سمجھی جائیں یا بعض کوتہ نظر اس کو بزرگانِ قدیم کی سادہ دلی خیال کریں لیکن جن کو خدا نے چشم حقیقت نگر عطا کی ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ باتیں معمولی باتیں نہیں بلکہ وحشی دلوں کے تسخیر کی گھاتیں ہیں۔ کاش ہم سمجھتے کہ مناسب طبع تعلیم کیا چیز ہے۔ ایک کاواک لکیریں کھینچنے والا لڑکا ایک دیا سلائی کی ڈبیوں کو جوڑ کے مکان بنانے والا بچہ بہترین آرٹسٹ اور اعلیٰ ترین انجنیر ہو سکتا ہے اور اُس سے بہت کچھ منفعت حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کو طبع خداداد سے کام لینے کا موقع دیا جائے لیکن افسوس ہے ہم رجحان طبیعت کا مطلق خیال نہیں کرتے اور مختلف الالوان طبیعتوں کو مروجہ تعلیم یونیورسٹی کے سیاہ رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ۔ 'کار بوزینہ نیست بنجاری' اس بیان سے غرض یہ ہے کہ میر انیس مرحوم شاعری کا خداداد جوہر اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کو اس کے اظہار کا پورا موقع ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دُنیائے شاعری میں انیس کا مثل نہیں نظر آتا۔ اس کو بھی رجحانِ طبیعت ہی کا کرشمہ کہنا چاہئے کہ میر انیس کی زبان سے پہلا شعر نکلا تو مرثیہ کا۔ یہ تو ابتدا کا حال تھا اب انتہا کا قصہ سنئے۔ میر آغا حسین صاحب جو عمادین دہلی میں سے ہیں اور آجکل حیدر آباد دکن میں تشریف رکھتے ہیں۔ بیان فرماتے تھے کہ میں ایک دفعہ حالت مرض الموت میں میر صاحب کی عیادت کو گیا تو معلوم ہوا کہ زنانخانہ میں تشریف رکھتے ہیں اطلاع کی تو پردہ کروا کے بلا لیا اندر گیا تو دیکھا میر صاحب مرحوم لحاف سے منہ ڈھانپے لیٹے ہوئے ہیں اور میر نفیس مرحوم پہلو میں بیٹھے ہیں میں بھی انھیں کے پاس بیٹھ گیا اور پکار کے پوچھا کہ میر صاحب مزاج کیسا ہے۔ اس کے جواب میں لحاف کے اندر ہی سے میر صاحب نے فرمایا کہ کیا کہوں

ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی — ایک گھٹنے سے جوانی کے بڑھاپا کیا کچھ

میں چونکہ ان کی خدمت میں گستاخ تھا اس لئے بے باکانہ عرض کیا کہ حضرت یہ تو آپ میر تقی مرحوم کی زبانی اپنا حال بیان فرما رہے ہیں۔ یہ سنکے میر صاحب نے منہ پر سے لحاف ہٹایا چند سکنڈ تک بغور میری طرف دیکھتے رہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فرمایا کہ ؎

اک جوانی کیا گئی سو درد پیدا ہو گئے — تو ہی اے پیری بتا ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے

میر آغا حسین صاحب فرماتے تھے کہ آج تک وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے اور اُس نورانی صورت کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں جو پیوند خاک ہو گئی راقم حروف نے ایک دفعہ بر سبیل تذکرہ یہ حکایت سید علی صاحب یونس سے (جو میر انیس مرحوم کے شاگرد اور ان کے خاص ملنے والوں میں ہیں) بیان کی تو انھوں نے اس کو سُن کے فرمایا کہ میں تم کو وہ شعر سناؤں جس کے بعد میر انیس مرحوم نے کوئی شعر نہیں کیا۔ یعنی انتقال کی صبح یا اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ میر صاحب مرحوم سو کے اُٹھے تو میر مونس مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ شب کو ایک مطلع خیال میں آیا ہے اس کو لکھ لو ہمارے بعد خواہ اُس پر سلام کہنا، خواہ غزل (چونکہ میر مونس مرحوم کو میر صاحب ہمیشہ غزل گوئی سے منع کرتے تھے اس لئے غزل کہنے کا اشارہ اس غرض سے کیا کہ ہمارے بعد تم کو غزل گوئی سے کون روکے گا) اور اسکے بعد یہ مطلع جو حقیقتاً انکی شاعری کا مقطع تھا پڑھا ؎

سب عزیز و اقربا نا آشنا ہو جائیں گے — قبر میں پیوند جتنے ہیں جدا ہو جائیں گے

اللہ اللہ وہ محبت کا پتلا، وہ وفا کا بندہ جس نے بچپن میں ایک بے زبان کی جدائی پر اظہار تاسف کیا تھا، آخری وقت کس حسرت و افسوس کے ساتھ دُنیا کی ناپائیدار محبت کا ذکر کر رہا ہے اور اپنے عزیز و احباب سے کس قدر بیگانہ اور نا امید ہو کے دُنیا سے جا رہا ہے ۔ (اُردوئے معلّٰی ۱۹۱۰ء)

امیر ہر چیز کی ابتدا چونکہ بہت خفیف ہوتی ہے اس لئے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن جب وہ باتیں منتہائے کمال کو پہونچ جاتی ہیں اسوقت ہماری آنکھیں ان ابتدائی خفیف باتوں کو ڈھونڈھتی رہتی ہیں ۔ جنھوں نے ان کو معراج کمال پر پہونچایا ۔ اس کا خیال تو اکثر لوگ کرتے ہیں کہ :۔ "یہ بچپنا ہے تو اس کا شباب کیا ہوگا" لیکن ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جو عمر رفتہ کی یاد تازہ رکھیں اور اس سے سبق لیں ۔ چونکہ میرا افسردہ اور مرا ہوا دل اسی لئے بنایا گیا ہے کہ گزرے ہوؤں کی یاد میں رویا کرے اور ان کے انجام کو سوچا کرے ۔ اس لئے سوا اس کے اور کوئی مضمون مجھے ملتا ہی نہیں کہ ان کی باتیں کروں اور سر دُھنوں ۔ اس کے قبل اُردوئے معلّٰی کے کسی پرچے میں "انیس کا ابتدائی اور انتہائی کلام" نذر ناظرین کر چکا ہوں اور آج ایک دوسرے مسیحائے سخن یعنی حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور کا ابتدائی اور انتہائی کلام سناتا ہوں

میرے جلیل القدر دوست حافظ جلیل حسن صاحب جلیلؔ بیان فرماتے تھے کہ حضرت کو بچپن ہی سے شاعری کا چسکا تھا یہ خبر جب انکے والد ماجد کو پہونچی تو ایکدن شب کو جبکہ منشی صاحب مرحوم بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے ان کے والد ماجد نے پوچھا "میاں ہم نے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو ذرا ہم بھی سنیں کہ ہمارا امیر کیسے شعر کہتا ہے" یہ سنکر امیر مرحوم پہلے تو بہت انکار کرتے رہے مگر شفیق باپ کے محبت آمیز اصرار سے مجبور ہو کر عرض کیا کہ گھر میں سب لوگ کہا کرتے ہیں کہ برسات گزری جاتی ہے اور بارش نہیں ہوتی اسی مضمون کو کہا ہے اور اس تمہید کے بعد یہ شعر جو حضرت نے اسی زمانہ میں تصنیف فرمایا تھا عرض کیا کہ :۔

ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی
اس غم سے ہے یارو مرے اشکوں کی روانی

یہ سُن کے شفیق باپ نے تعریف سے دل بڑھایا کہ بھئی شعر تو بہت صاف ہے اور مضمون بھی سچا لیکن تمھارا سن ابھی اس مشغلہ کے لئے موزوں نہیں پہلے اچھی طرح پڑھ لکھ لو اُس کے بعد شعر کہنا ۔ یہ روایت اس زمانہ کی ہے جب منشی صاحب پندرہ برس کے تھے ممکن ہے کہ اس کے قبل انھوں نے اور بھی شعر کہے ہوں ۔ لیکن عموماً لوگوں کو جو ان کی شاعری کا حال معلوم ہوا وہ اسی واقعہ سے اس لئے اگر ہم اس شعر کو امیر کا ابتدائی کلام کہیں تو بیجا نہیں یہ جو کہتے ہیں کہ بچے کے پاؤں پالنے میں معلوم ہوتے ہیں بالکل سچ ہے ۔ اگر ہم اس شعر کی خوبی معلوم کرنا چاہیں تو اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ اسی مضمون کو اسی بحر و قافیہ میں موزوں کر کے دیکھیں، میرا خیال ہے کہ اس امتحان کے بعد ہر شخص کو یہ کہنا پڑے گا کہ :۔ سالے کہ نکوست از بہارش پیدا است ۔ پندرہ برس کے لڑکے کا خیال تو آپ سن چکے اب دیکھئے کہ بہتر برس کا مشاق سخن کیا کہتا ہے ۱۳۱۸ھ کا واقعہ ہے کہ جب امیر مرحوم نے حیدر آباد کا سفر کیا جو یقیناً ان کا سفر آخرت تھا تو راہ میں ایک مسدس اعلیحضرت حضور نظام کی مدح میں تصنیف فرمایا تھا جو چھپ چکا ہے اور وہ بھی ان کا آخر کلام سمجھا جا سکتا ہے ۔ لیکن حقیقتاً اس کے بعد بھی انھوں نے ایک غزل کے چند شعر کہے تھے جس کا مقطع جو حقیقت میں امیر مرحوم کی شاعری کا مقطع ہے ان کا انتہائی کلام ہے اور وہ یہ ہے کہ

شاعری میں امیرؔ کی خاطر — میرؔ اپنی زبان چھوڑ گئے

افسوس ہے کہ میر رہے نہ ان کی زبان، خالی باتیں رہ گئی ہیں، ہائے مجھے استاد مرحوم کا یہ کہنا کسی طرح نہیں بھولتا کہ :۔

ہے آج جو سرگزشت اپنی — کل اس کی کہانیاں بنیں گی

(اُردوئے معلّٰی نومبر ۱۹۱۰ء)

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیازؔ کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان و تخئیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندیٔ مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے ۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ۔ منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

زبان اور رسم الخط

(فرمان فتحپوری)

پروفیسر احتشام صاحب کی یہ تحقیق کہ "زبان اور اُس کے رسم الخط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے" اور "کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھنے سے اس کی ہیئت و حقیقت پر اثر نہیں پڑتا" میرے نزدیک صداقت سے عاری ہے اور پروفیسر موصوف نے جو نتائج مرتب فرمائے ہیں اُن میں عجلت سے کام لیا گیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر اُن کی تحریر خود اُن کے دعووں کی تردید کرتی ہے

زبان نام ہے مجموعۂ الفاظ کا اور الفاظ مرکب ہیں اصوات سے - اصوات نام ہے اُن تصاویر - خطوط - نقوش - علامات یا نشانات کا جو ارتقا کی منازل طے کرکے آج حروف کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں اور اُن کا مقصد ماسوائے اظہار معنی کچھ نہیں ہے - مدیر نگار نے احتشام صاحب کے مضمون پر تعارفی نوٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "رسم الخط نام ہے چند نقوش کا جو تلفظ کے ادا یا اظہار کے لئے فرض کر لئے گئے ہیں" اس تعریف میں ایک بڑی کمی ہے وہ یہ کہ رسم الخط کو تلفظ کے ساتھ اظہار معنی کا بھی وسیلہ نہیں قرار دیا گیا

زبان کے آغاز میں جب کوئی آواز کسی کے منہ سے نکلی ہوگی تو آواز دینے والے نے اپنے مقصود خیال کو سامع تک پہونچانے کے لئے شے مقصود بجنسہٖ پیش کی ہوگی یا مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے مشار الیہ کی تصویر یا اس سے مناسبت رکھنے والے خطوط و نقوش بنا دئے ہوں گے مرئی اور خارجی اشیا کے اظہار کیلئے جو آوازیں نکلی ہوں گی ان کے ابلاغ میں چنداں سہولت رہی ہوگی لیکن غیر مرئی اور داخلی کوائف کو سمجھانے کے لئے بڑی دشواریاں پیش آئی ہوں گی آج بھی ہم خارجی اثرات کو سمجھانے اور سمجھنے میں اتنی دقت محسوس نہیں کرتے جتنی امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ کو سمجھانے میں - یہی وجہ ہے کہ مختلف احساسات ( ) مثلاً عشق - حسن - خوشی - غم - غصہ وغیرہ کے معنی کا تعین ہو سکا اور نہ آج تک اُن کی جامع اور متفق الخیال تعریفیں مرتب ہو سکیں جب ہم اس مسئلہ کو عقل و فکر کے میزان پر تولتے ہیں تو صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احساسات (Feelings) وجذبات (Emotions) کے اظہار معنی کے لئے بھی کوئی نہ کوئی نقش یا تصویر ہی بنائی گئی ہوگی - اس طرح خارجی اور داخلی کوائف کے مطالب کا اظہار صرف نقوش یا حروف سے ممکن تھا اور آج بھی ادائے معنی کے لئے حروف استعمال کئے جاتے ہیں اور انھیں حروف کا دوسرا نام رسم الخط ہے - پروفیسر احتشام صاحب بھی زبان کے Origin تاریخ - ارتقا و تعمیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں - "الفاظ خیالوں ملفوظی - یا صوتی علامت کہے جا سکتے ہیں اور اُن کی تصویریں تحریری علامات - اس تحریری علامت کا مقصد کسی آواز یا آوازوں کے مجموعہ یا خیال کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے..... تصویری تحریر خیالات کی علامت مقرر کرنے کی ابتدائی کوشش تھی..... لیکن جب انسانی ذہن استوار ہوا اور اس کی تحریری طاقت بڑھی تو اس نے آوازوں کی علامتیں مقرر کرنے کی کوشش کی..... اور خیال کیا جاتا ہے کہ حروف تہجی اُنھیں تصویری تحریروں کی ارتقائی شکل ہیں - تاریخ کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف کوئی نہ کوئی معنی رکھتا ہے اور اُن کی ابتدائی شکل اس مفہوم یا معنی سے صوری مماثلت رکھتا ہے" احتشام صاحب کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی میری طرح حروف یا رسم الخط کو ادائے تلفظ و معنی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس حقیقت سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان اور اس کے رسم الخط میں معنوی تعلق ہے نہ یہ کہ "اُن میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے" میں سمجھتا ہوں کہ احتشام صاحب نے دانستہ انجام کار کو نظر انداز کر دیا ہے اور خواہ مخواہ اس مسئلہ کی بحث کو طول پکڑنے کا موقع دیا ہے

اگر اصوات اور حروف کے ربط کو اس لئے نہیں تسلیم کیا جاتا کہ حروف مفروضہ ہیں اور اُن کے دیکھنے سے آواز کا پتہ نہیں چلتا تو میں یہ کہوں گا کہ حروف کی طرح معانی بھی مفروضہ ہیں اور کسی لفظ کو سنکر یا پڑھ کر ہم اس کے معنی تک نہیں پہونچ سکتے اور یہی وجہ ہے کہ ہر چیز و ہر کیفیت کے لئے کئی کئی آوازیں یا الفاظ وجود میں آئے۔ اگر کوئی لفظ اپنے مفہوم کو بلا شرکتِ نقش یا حرف دوسروں تک پہونچا سکتا تو مختلف زبانیں بھی وجود میں نہ آتیں لیکن لفظ کے معنی مفروضہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ لفظ اور معنی میں کوئی ربط نہیں یا کسی وقت معنی کو لفظ سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ کوشش کی جائے تو کیا غیر متعین یا بے معنی الفاظ کے مجموعہ پر بھی زبان کا اطلاق ہو سکے گا۔ اگر نہیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ رسم الخط اور زبان میں معنوی ربط ہے اور رسم الخط مفروضہ ہونے کے باوجود زبان سے جدا نہیں ہو سکتا یہ ضرور ہے کہ زبان یا اصوات کا آغاز رسم الخط سے پہلے ہوا لیکن یہ کہ "وہ ایک دوسرے کے پابند نہیں" یا اُن میں باطنی ربط نہیں حقیقت سے دور ہے

اگر حروف یا رسم الخط کا تعلق براہ راست تلفظ و معنی سے ہے تو پھر یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ "اگر کسی زبان کو کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھا جائے تو اُس کی اصلیت و حقیقت پر حرف نہ آئے گا۔ ہر خطۂ زمین کے باشندے اپنے گرد و پیش قدرتی حالت۔ آب ہوا۔ موسم۔ پیداوار اور معاشرہ سے متاثر ہوتے ہیں اور اُن کے اصوات پر بھی مقامی فضا کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر خطۂ زمین کے لوگوں کے اصوات یا الفاظ یا زبان جداگانہ ہے اور اُن کے اظہار مفہوم و ادائے تلفظ کے لئے جداگانہ نقوش یا حروف یا رسم الخط میں وضع کر لئے گئے ہیں۔ ورنہ تمام زبانوں کے حروف تہجی اصوات و اشکال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مماثل ہوتے۔ لیکن جب ایسا نہیں ہے تو پھر ایک زبان کے حروف تہجی یا رسم الخط کو کسی دوسری زبان پر کس طرح منڈھا جا سکتا ہے

اقتشام صاحب نے ایک ادنیٰ مثال یعنی (High) کو اُردو میں لکھ کر یہ کلیہ قایم کر لیا کہ ہر انگریزی لفظ کو اُردو رسم الخط میں لکھا جا سکتا ہے اور کہیں بھی تلفظ یا معنی میں التباس نہ ہوگا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ موصوف نے صرف لفظ High کو بطور مثال کیوں پیش کیا اگر حرف H کی آواز سمجھانی مقصود تھی تو Head اور Hid یا Hell اور Hill کو اُردو رسم الخط میں لکھتے تاکہ انھیں پہلے ہی قدم پہ دشواری کا احساس ہو جاتا

انگریزی میں مشابہ الصوت الفاظ کی کثرت ہے اور جب اُن کی ملفوظی و صوتی صورتیں اُردو رسم الخط میں بالکل یکساں ہو جائیں گی تو اُنکی تفہیم میں ضرور دقت ہوگی مثلاً Air اور Heir - I اور Eye - Birth اور Berth - Whole اور for - Lawyer اور Liar ، Loser - Loose اور Fowl اور foul - Die اور Dye - Hole اور Son - Sun اور Sea اور See وغیرہ کو اگر اُردو رسم الخط میں لکھا جائے تو دونوں لفظوں کی صورت اور تلفظ ایک دوسرے سے مماثل ہو جائے گا اور چونکہ انگریزی میں ہم آواز الفاظ کی بہتات ہے اس لئے مستثنیات کے اصول بھی کام نہ دیں گے مشابہ الصوت الفاظ سے قطع نظر اکثر مختلف الصوت الفاظ کا تلفظ ناممکن ہو جائے گی مثلاً Man - Mean اور Main کو اُردو میں صرف "مین" لکھا جائے گا اس طرح Fear اور Fair کو صرف "فیر" - Chair اور Cheer کو محض "چیر" لکھا جا سکیگا اور اس طرح امتیاز تلفظ میں بڑی دشواریاں حایل ہوں گی۔ اکثر الفاظ کا تلفظ اُردو رسم الخط میں ادا کرنا ناممکن ہوگا جیسے Pure اور Shore کو ترتیب سے "پور" اور "شور" لکھا جائے گا اور ان کو اُردو میں انگریزی کے دوسرے بامعنی لفظ Pour اور Shure تصور کیا جا سکتا ہے اس طرح Badge Catch اور اُردو رسم الخط میں "کیچ"۔ "بیج" اور "بیچ" ہو جائینگے اور اِن سے اُردو کے دوسرے بامعنی الفاظ مراد ہو سکتے ہیں۔ انگریزی زبان میں Vowel یعنی a، e، i، o اور u اگرچہ انفرادی آوازیں رکھتے ہیں۔ لیکن الفاظ میں اُن کی آوازیں مماثل ہو جاتی ہیں جیسے ought، Sir - early - all اور Weight ۔۔ ظاہر ہے کہ ان کو اُردو میں الف یا ع سے لکھا جائے گا اور مفاہیم کو سمجھنے میں مشکل پیش آئے گی c اور s کی آوازوں کو ش۔ س۔ ص میں ہر حرف ادا کر سکتا ہے اور c، q اور K کی آواز رکھنے والے الفاظ مثلاً Coat۔ quote اور Kite

کو صرف ک سے اور Z کی آواز رکھنے والے لفظ مثلاً Zoo کو ذ۔ ز۔ ژ۔ ض۔ ظ سے لکھا جاسکتا ہے اور یہ تنوع پسندی زبان کو بھول بھلیاں بنادے گی

پھر بھی انگریزی کو اُردو رسم الخط میں لکھنا اگر آسان قرار دیا جائے تو اس کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ اُردو مرکب ہے متعدد زبانوں سے اور اسکے حروف تہجی مختلف زبانوں سے مستعار ہیں ورنہ اگر انگریزی کو عربی رسم الخط میں یا عربی کو انگریزی رسم الخط میں لکھنے کی کوشش کی جائے تو انگریزی کے حروف P، T، D، ch کی آوازیں عربی میں کہاں سے لائی جائیں گی اور عربی زبان کے اعراب۔ حرکات اور سکنات کو ہر قدم پہ انگریزی رسم الخط میں کس طرح پیدا کیا جائے گا

اسی طرح اگر اُردو کو انگریزی رسم الخط میں تبدیل کیا جائے تو د۔ ڑ۔ ژ۔ ت۔ ط۔ ع۔ غ۔ خ اور ق کی آوازیں کہاں سے آئیں گی۔ مثلاً "تمام" انگریزی میں Tomam دل (Dil) ڈل (ٹمام) پہاڑ Pahor (پہار)۔ طالب Talib (ٹالب)۔ وسیع Wosi (وصی)۔ غریب Ghareeb (گریب)۔ خدا (Khuda) (کھُدا)۔ قلم Kalam ہوجائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ Th سے د کی Gh سے غ کی اور Kh سے خ کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں تو پھر "دھ" "گھ" اور "کھ" کی آوازیں کیسے ادا کی جائیں گی۔ اور غل و کھُل۔ قل و کل۔ دَم و تھم اور خال و کھال کا انگریزی رسم الخط میں کیسے امتیاز ممکن ہوگا۔ اسی طرح جب آ۔ ع کی آوازوں کے لئے صرف A ث۔ ص۔ س کے لئے صرف S وح اور ہ کے لئے صرف H اور ذ۔ ز۔ ژ۔ ض۔ ظ کے لئے صرف Z کا استعمال ہوگا تو کیا مشابہ الصوت الفاظ مثلاً:۔ امل و عمل۔ تعمّل و تامّل۔ امارت و عمارت۔ عاصم و آثم۔ توسل و توصل۔ سدا و صدا۔ سفر و صفر۔ معصوم و ماثوم۔ ثواب و صواب۔ صحاب و سحاب۔ سیف و صیف۔ نذیر و نظیر۔ ظرف و ژرف اور ظن و زن کے معنی متعین کرنے میں غیر معمولی دقت پیش نہ آئے گی جبکہ ان کے Root کا پتہ چل سکے گا

ہندی حروف تہجی اگرچہ تعداد میں تمام زبانوں سے زیادہ ہیں مگر اس میں بھی یہ صلاحیت نہیں کہ کسی دوسری زبان کو صوتی اور معنوی سالمیت کے ساتھ اپنے رسم الخط میں ادا کرسکے۔ ع کی آواز ہندی رسم الخط میں ادا ہی نہیں ہوسکتی اور وسیع۔ جمیع۔ سجیع کو ہندی میں صرف वसी (وسی) जमी (جمی) اور सजी (سجی) لکھا جاسکے گا اور مشکل یہ ہے کہ یہ خود اُردو کے بامعنی الفاظ ہیں۔ ژ کی آواز رکھنے والے الفاظ مثلاً اژدہا۔ اژدہام۔ ژالہ و اژگوں۔ ژرف اور ژولیدہ ہندی رسم الخط میں اپنی صوتی کیفیت یقینی کھو بیٹھیں گے۔ الف ممدودہ کی آواز ہندی رسم الخط میں نہیں ادا ہوسکتی۔ مثلاً "آل" کا لفظ ہندی میں صرف माल (مال) ہوجائے گا اور اگر "آل" کو ہندی میں मआल لکھا جائے تو خود ہندی رسم الخط میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہوگی کیونکہ ہندی میں अ کا استعمال اس طرح ہوتا ہی نہیں۔ علاوہ ازیں ح اور ہ کے لئے صرف ह کا۔ ذ۔ ز۔ ژ۔ ض۔ ظ کے لئے صرف ज۔ ت۔ ط کے لئے त اور س۔ ص۔ ث کے لئے صرف स استعمال کیا جائے گا اور چونکہ اس طور پر الفاظ کے مادوں (Roots) کا پتہ نہ چلے گا۔ اس لئے معنی سمجھنا ناممکن ہوجائے گا۔

زبان اور رسم خط کا باہمی تعلق

(محمد عزیز حسن مراد آبادی)

میں نے اپنے گزشتہ مقالہ (نگار اگست ۱۹۵۱ء) میں حروف کی ابتدا اور ان کی حیثیت کے متعلق اپنا خیال مختصراً پیش کر دیا تھا مگر سبزواری صاحب

نے اپنے مقالہ (نگار۔ اگست ۱۹۵۱ء) میں اس بحث کو آگے بڑھانے پر زور دیا ہے اور حروف کے متعلق ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ انسان نے جب بولنا سیکھا تو اول ادائے مطلب کے لئے مختلف الفاظ وضع کر لئے اور اُن سے کام لیتا رہا۔ عرصۂ دراز کے بعد جب مختلف معاشرتی ضروریات سے مجبور ہو کر فنِ تحریر ایجاد کرنا چاہا تو اس کو سب سے پہلے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو الفاظ وہ بولتا ہے ان کا تجزیہ کر کے معلوم کرے کہ وہ سب کتنی مختلف آوازوں سے مرکب ہیں اور اس طرح وہ آوازیں ہر زبان میں بیس اور تیس کے درمیان نکلیں (اس تعداد میں ایک دو زبانوں کے علاوہ کہیں استثنا نہیں ہے) اُس نے اُن تمام آوازوں کی علٰحدہ شکلیں وضع کر لیں اور اُن شکلوں کے علٰحدہ نام بھی رکھ لئے۔ اس مسئلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ مختلف ملکوں کے رہنے والوں نے زبان سے نکلی ہوئی آوازوں میں بہت کچھ اختلاف پایا۔ جیسا کہ ہم مختصراً اپنے گزشتہ مقالہ میں ظاہر کر چکے ہیں۔ عرب اور فارس میں ہمیں ت ملتی ہے مگر اس کے بالکل ہی قریب دوسری آواز ہے ط اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندوستان اور انگلستان میں ط ہے اور ت موجود نہیں۔ یہی حال د اور ڈ۔ ر اور ڑ کا ہے۔ لہجہ کی تعمیر ماحول، آب و ہوا، حلق و زبان کی ساخت، مشاغل زندگی۔ مذاق طبیعت اور رجحان طبعی سے مجموعی طور پر ہوئی ہے۔ اس میں انسان کے قصد و ارادہ کو مطلق دخل نہ تھا، زبان و دہن ہی کو ہم الفاظ کی بنیاد کہتے ہیں۔ ان میں تغیر یا کمی کرنا زبان کو بدل دینے کے مترادف ہے۔ انھیں آوازوں کو جو انسان کی زبان سے ادا ہوتی تھیں بعد کو مختلف اشکال (یعنی حروف) کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور اس طرح زبان اور رسم خط دونوں کی بنیاد ساتھ ساتھ پڑی

حروف کی ان تحریری شکلوں نے ایک طرف اُن تمام آوازوں کو محسوس شکل عطا کر دی اور دوسری طرف اس کا موقع فراہم کر دیا کہ زبان ترقی کے مدارج طے کرے، ظاہر ہے کہ مختلف قوموں نے حروف کی مختلف شکلیں وضع کیں اور اگر اس میں نفسیات کا دخل بھی تسلیم کیا جا سکے تو یہ مختلف قوموں کے اختلاف مذاق و ذہنیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ابتدائی عربی رسم الخط میں حتٰی کہ خط کوفی تک میں دوائر موجود نہیں ہیں۔ دوائر کی ابتدا خطِ نسخ سے ہوئی ہے۔ موجودہ انگریزی رسمِ خط اور بعض دیگر خطوط میں دوائر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حروف کی شکلیں اس طرح وضع کی گئیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملائے جا سکیں۔ مثلاً عربی کے ب اور ا کو باہمی ترکیب دیکر کہا جائے گا تو "با" ہوگا مگر عربی کے ب اور انگریزی b کو باہمی ترکیب دے جانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح دیوناگری حروف کے ساتھ اور کسی زبان کے حروف نہیں ملائے جا سکتے۔ عربی سب سے پہلے حمیری رسم خط میں لکھی جاتی تھی۔ اس کے بعد خط کوفی اختیار کر لیا گیا اور تقریباً دوسری یا تیسری صدی ہجری میں خط نسخ وضع ہوا اور اس کے بعد جیسے جیسے قوم کا مذاق نکھرتا گیا مختلف اقسام کے خطوط وضع ہوتے گئے۔ نستعلیق۔ طغرا۔ شفیعہ۔ فردوسیہ۔ شکست وغیرہ وغیرہ۔ عرب کی تہذیبی اور معاشرتی ترقی کی مکمل تاریخ ہمارے سامنے ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسم خط کی ترقی میں قومی نفسیات کا کتنا دخل ہے۔ عرب کی سادہ مزاجی تقریباً بنو امیہ کے اخیر دور تک باقی رہی اور اس وقت تک عرب صرف اسلامی احکام و اوامر سے واقف تھے۔ ہارون رشید اور مامون اعظم کے عہد میں دیگر علوم و فنون بھی عربوں نے سیکھنے شروع کئے اور ایرانی قوم کے مسلمان ہو جانے کے بعد اُن سے میل جول کے باعث عرب قوم میں تکلفات اور نزاکتیں پیدا ہونا شروع ہوئیں اور قومی ذہنیت کے اس تغیر کا اثر رسم خط پر بھی ہوا اور خط نسخ ایجاد کیا گیا جس میں دوائر پیدا ہوئے اور اشکال حروف نستعلیق سے قریب تر ہو گئے۔ اس تمام بحث سے ہمارا مدعا یہ امر ظاہر کرنا ہے کہ ہر قوم کے رسم خط میں اُس قوم کی مخصوص ذہنیت اور انفرادی قومی نفسیات لازماً شامل ہوتی ہے اور زبان کی تعمیر بھی اسی قومی نفسیات کے تحت ہوتی ہے۔ جس طرح رسم خط ایک قوم کے نفسیاتی احوال اور مذاق و رجحان کا پروردہ ہوا کرتا ہے وہی حالت زبان کی بھی ہے اور ہم نے اپنے گزشتہ مقالہ (نگار۔ اگست ۱۹۵۱ء) میں اس امر کو واضح کیا تھا کہ ایک زبان کو صرف اُسی کے مخصوص رسم خط میں لکھا جا سکتا ہے اور چونکہ زبان کی تعمیر میں قومی نفسیات شامل ہے اس لئے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسم خط میں بھی وہی نفسیات کارفرما ہوں گی۔ عربی رسم خط میں جو مختصر نویسی کی صفت موجود ہے وہ غالباً دنیا کے کسی دوسرے رسم خط میں نہیں ہے، اس سے قومی نفسیات کا رسم خط میں دخل صاف ظاہر ہے اور اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ رسم خط اس قوم کی ذہنی خصوصیات اور قومی نفسیات سے وابستہ ہوتا ہے تو پھر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ رسم خط زبان کی ترقی میں بھی مدد و معاون ہوتا ہے

سب سے پہلی چیز جو لہجہ سے متعلق ہے وہ مختلف زبانوں کے مختلف حروف ہیں۔ عربی کا ث جب انگریزی رسم خط میں لکھنے کی کہیں ضرورت پیش آجاتی

ہے تو (Th) لکھتے ہیں۔ حالانکہ خود انگریزی زبان میں (Th) کا تلفظ دو طرح ہوتا ہے ایک (تہہ) جیسے Think میں ہے۔ دوسرے دال کی آواز دیتا ہے جیسے The میں۔ عربی میں اس کی جو آواز ہے اس کے لئے انگریزی میں مسلم طور پر کوئی حرف موجود نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ٹرکی کے سلطان عثمان کو انگریز مورخین نے Othman لکھا ہے۔ بعض معمولی درجہ کے مصنفین ثا کو S بھی کہتے ہیں جیسے Osman اس میں کوئی صحیح اطلاق ثا کا نظر نہیں آتا اس کی وجہ یہی ہے کہ انگریز قوم عربی کے حرف ثا کا صحیح تلفظ ادا کر ہی نہیں سکتی۔[1] اسی طرح عربی کا خا ہے جسکو انگریزی رسم خط میں Kh سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس Kh سے جو آواز اصولاً پیدا ہونا چاہیئے وہ صرف "کھا" سے ادا ہوتی ہے۔ درۂ خیبر کو انگریز مورخین Khyber Pass کہتے ہیں اور گفتگو میں بھی بجائے "خیبر" کے "کھیبر پاس" کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر قوم تلفظ ہی کے اصول پر حروف وضع کرتی ہے اور حروف اُس قوم کی زبان کو اس کے اپنے اصلی احوال پر قایم رہنے اور ترقی دینے کا باعث ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر تلفظ زبان کی ترقی کا باعث ہے تو رسم خط کو بھی یقیناً ترقی کا باعث ہونا چاہیئے۔

---

[1] بات یہ نہیں ہے بلکہ خود ترکی زبان میں عثمان کا تلفظ عتھمان ہے اور انگریزی مصنفین انھیں کے تلفظ کے پیش نظر عثمان کو Othman لکھتے ہیں (نیاز)

ایک قدیم کتب خانہ کی بعض نادر کتابیں

غیاث اللغات مطبوعہ ۱۸۷۳ء (فارسی) ---------- چار روپیہ
سواطع الالہام از فیضی (عربی) ---------- سات روپیہ
منتخب اللغات داراشکوہی (فارسی) ---------- سات روپیہ
علم جفر و شعبدہ جات (اُردو) ---------- چار روپیہ
مثنوی یوسف زلیخا جامی (فارسی) ---------- تین روپیہ
مصداق الرمل، انوار الرمل (فارسی) ---------- سات روپیہ
مراثی انیس ---------- چھ روپیہ
نالۂ عندلیب (فارسی) ---------- آٹھ روپیہ
ترجمہ حدائق البلاغت (اُردو) ---------- تین روپیہ
علم الکتاب خواجہ درد (فارسی) ---------- چھ روپیہ

طب کی اُردو کتابیں

ترجمہ کلیات نفیسی مکمل ---------- سولہ روپیہ
ترجمہ قانون بوعلی سینا مکمل ---------- تیس روپیہ
گنج حکمت مکمل ۱۳ حصے ---------- دس روپیہ
مخزن المفردات ---------- چار روپیہ
امراض چشم ---------- پانچ روپیہ

ترجمہ کلیات و معالجات ---------- پندرہ روپیہ
بحرِ محیط۔ حکیم اصغر حسین فرخ آبادی ---------- آٹھ روپیہ
تشریح کبیر حکیم محمد کبیر الدین دہلوی ---------- بارہ روپیہ
کتاب التشخیص مکمل ---------- آٹھ روپیہ
اسرار حکمت از حکیم محمد عبدالعزیز لاہوری ---------- چار روپیہ

طب کی فارسی کتابیں

قرابادین کبیر مکمل حکیم سولہ روپیہ
تجربات فرنگی (از ہنری پرکٹر) ---------- پندرہ روپیہ
مخزن الادویہ معہ تحفۃ المومنین از حکیم محمد حسین علوی شیرازی .. دس روپیہ
محیط اعظم مکمل از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ---------- پچیس روپیہ
اکسیر اعظم " ---------- پینتیس روپیہ
مفرح القلوب۔ مفید الاحسام (علم جراحی) ---------- بارہ روپیہ
علاج الامراض از حکیم محمد شریف خاں دہلوی ---------- آٹھ روپیہ
مخزن اکسیر مکمل ۲ جلد از حکیم امام الدین پاک پٹن ... دس روپیہ
قرابادین اعظم از حکیم محمد اعظم خاں دہلوی ---------- پندرہ روپیہ
قرابادین قادری از حکیم محمد اکبر ارزانی ---------- بارہ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

باب الاستفسار

علم جفر

(جناب سید دل محمد فضا جالندھری۔ خانیوال، ملتان)

بعض اصحاب علم جفر کو امام جعفر صادق سے منسوب کرتے ہیں اور بعض حکماء کا خیال ہے کہ یہ علم حضرت دانیال کے ذریعہ دنیا میں پھیلا
براہِ کرم نگار کے ذریعہ تفصیلی روشنی ڈالئے اور اس کے وضعی اصولوں پر بھی سیر حاصل بحث فرمایئے تاکہ حکم لگانے کا طریقہ معلوم ہو سکے

(نگار) علم جَفْر (جَفَر نہیں) کے متعلق عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے موجد و مخترع امام جعفر صادق تھے، اور بعض نے دانیال نبی کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا ہے۔ دانیال کا ذکر عیسوی لٹریچر میں تو بیشک پایا جاتا ہے لیکن اسلامی لٹریچر میں بہت کم۔ اور اگر پایا بھی جاتا ہے تو اسکی حیثیت ایسی نہیں کہ انھیں کوئی نبی تصور کیا جائے۔ طبری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دانیال ان قیدیوں میں سے ایک تھے جو بخت نصر کے زمانہ میں بیت المقدس گرفتار کر کے لائے گئے تھے اور چونکہ آدمی بہت ذی فہم تھے اس لئے رفتہ رفتہ وہ وزارت کے عہدہ تک پہونچ گئے

مسعودی نے مُروج الذہب میں دو دانیال کا ذکر کیا ہے، پہلے اور بڑے دانیال کا زمانہ اس نے نوح اور ابراہیم کے درمیان کا زمانہ بتایا ہے اور انھیں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پیشین گوئیاں کرتے تھے اور انھیں پیشین گوئیوں کا مجموعہ کتاب الجَفر کے نام سے انھوں نے مرتب کیا تھا۔ رہا امام جعفر صادق سے جفر کو علمی و فنی حیثیت سے منسوب کرنا، یہ بھی کوئی صحیح تاریخی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ اس ظن و قیاس کا سبب غالباً وہ روایت ہے جو شیعیت کے ابتدائی زمانہ میں رواج پا گئی تھیں

جب شیعیت کی سیاسی تحریک کو زیادہ مضبوط و پایدار بنانے کے لئے اس کو مذہبی رنگ دیا گیا تو اس سلسلہ میں منجملہ اور بہت سی روایات کے اس روایت کی بھی نشر و اشاعت کی گئی کہ خانوادۂ حضرت علیؑ کے تمام افراد کو جو خطا و عصیاں سے پاک ہیں علم لدنی حاصل ہے اور وہ تمام ان واقعات سے باخبر ہیں جو قیامت تک رونما ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک ایسی کتاب کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جس میں حضرت علیؑ نے قرآن کے پنہاں مگر صحیح مفہوم کو ظاہر کیا تھا۔ الغرض حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے متعلق شیعوں میں یہ عقیدہ عام طور پر رائج ہو گیا تھا کہ وہ غیب کے حالات جانتے ہیں اور یہ سب کچھ کتابی شکل میں ایک کے بعد دوسرے کو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے

تیسری صدی ہجری میں بشر بن المعتمر معتزلی نے ظاہر کیا کہ اس کتاب کو وہ جفر کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دمیری نے بھی اپنی کتاب الحیوان میں ابن قتیبہ کی کتاب ادب الکاتب کے حوالہ سے ظاہر کیا ہے کہ جفر ایک کتاب تھی جسے جعفر بن محمد صادق (چھٹے امام) نے مرتب کیا تھا اور جس میں قیامت تک کی تمام پیشین گوئیاں درج تھیں۔ اس کتاب کا نام جَفْر اس لئے قرار پایا کہ وہ بکری کے بچہ کی کھال پر لکھی گئی تھی (جفر عربی میں بکری کے بچہ کو کہتے ہیں) لیکن حیرت کی بات ہے کہ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں امام جعفر صادق کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ علم الکیمیا کے ذکر کے سلسلہ میں وہ جابر بن حیان کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی لیا ہے، لیکن جفر نامی کتاب کا کوئی ذکر نہیں کرتا

اصل قصہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں (جیسا کہ ابھی میں نے ظاہر کیا) شیعہ جماعت پیشین گوئیوں کی متعدد کتابوں کے وجود کی قایل تھی، جنھیں وہ

ملاہیم کہتے تھے۔ انھیں میں سے ایک کتاب جفر تھی، دوسری جامعہ اور تیسری مصحف فاطمہ

یہ عقیدہ کہ ائمۂ معصومین غیب کے حالات سے واقف تھے مختلف طریقوں سے رائج کیا گیا۔ چنانچہ ایک شیعی مورخ لکھتا ہے کہ جب مامون الرشید نے امام موسیٰ رضا کو اپنا جانشین مقرر کیا تو انھوں نے مامون کو لکھا کہ "جفر اور جامعہ کی رو سے یہ نامزدگی ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے"

اس سلسلہ میں موحدین کی روایت بھی سن لیجئے، وہ کہتے ہیں کہ ان کا مہدی، غزالی کا محبوب شاگرد تھا اور غزالی کے پاس جفر کی کتاب موجود تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غزالی نے جفر ہی کی مدد سے ابن تومارت کے درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی کی تھی اور مرتے وقت یہ کتاب ابن تومارت ہی کو دیدی تھی۔ لیکن اس سلسلہ میں ابن خلدون اور البیرونی کی رائیں زیادہ مستند معلوم ہوتی ہیں۔ بیرونی امام جعفر صادق کا بڑا مداح تھا، لیکن اس نے جفر کو ان سے کہیں منسوب نہیں کیا۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ "جفر بھی ملاہیم کے سلسلہ میں ایک کتاب رہی ہوگی جسے امام جعفر صادق نے مرتب کیا ہوگا، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا"

ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون بن سعید الاجلی کے پاس، امام جعفر صادق کی ایک کتاب جفر کا ہونا بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ البتہ عہد ہارون الرشید کے ایک منجم یعقوب بن اسحاق الکندی کی ایک کتاب جفر کا ذکر ضرور اس نے کیا ہے، جس میں علم نجوم کی رو سے کچھ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں لیکن یہ کتاب بعد کو ناپید ہوگئی

یہ تھی جفر کی تاریخی حیثیت جس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے یہ ملاہیم کے قسم کی پیشین گوئی کی کوئی کتاب رہی ہو، جسے شیعی حضرات امام جعفر صادق سے منسوب کرتے ہیں، لیکن اس کی فنی حیثیت پر اُس عہد کے کسی مورخ نے کچھ نہیں لکھا۔ بعد کو لوگوں نے بیشک علم الحروف اور حروف ابجد کے اعداد سے اس کا تعلق قرار دیا اور رفتہ رفتہ جفر علم سیمیا کی ایک شاخ قرار پائی، گو ابن خلدون نے علم سیمیا کی بحث میں کہیں جفر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ابجد کے حروف یا اس کے اعداد سے نتائج کا استخراج یا مستقبل پر حکم لگانا، یہ بھی صرف اس عقیدہ کی بناء پر تھا کہ قرآن چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے عربی حروف بھی بڑی متبرک چیز ہیں اور یہاں تک کہ ان کے اعداد کے پیش نظر پیشین گوئی بھی کی جاسکتی ہے۔ جفر و رمل دونوں تقریباً ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں اور ان کے ساقط الاعتبار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دونوں مٹتے جارہے ہیں اور غالباً نصف صدی کے بعد ان کو لوگ بالکل بھول جائیں گے۔

"نگار" کے پرانے متفرق پرچے

سنہ ۳۱ء = جنوری (فراست التحریر) عاء - جولائی ۸ء - اگست ۸ء - اکتوبر ۱۲ء - نومبر ۸ء - دسمبر ۸ء -

سنہ ۳۲ء = فروری ۱۲ء - مئی ۱۲ء - جولائی ۱۲ء - ستمبر ۱۲ء -

سنہ ۳۷ء = جنوری، فروری (اصحاب کہف) عہ ء - مارچ ۸ء - مئی ۱۲ء - جون ۸ء - جولائی ۱۲ء - اگست ۱۲ء -

سنہ ۳۸ء = جنوری (تاریخ اسلامی ہند) عہ ء - فروری ۱۲ء - اپریل عہ ء - مئی تا دسمبر فی کاپی ۸ء -

سنہ ۳۹ء = جنوری (مصحفی نمبر) عاء - فروری ۸ء - مارچ ۸ء - اپریل ۸ء - اکتوبر ۸ء -

سنہ ۴۰ء = فروری ۸ء - مارچ ۸ء - اپریل ۸ء - مئی ۸ء - اگست ۸ء - ستمبر ۸ء - اکتوبر ۸ء - نومبر ۸ء - دسمبر ۸ء -

سنہ ۴۱ء = جون تا دسمبر فی کاپی ۸ء -

سنہ ۴۲ء = مارچ ۱۲ء - اپریل ۸ء - مئی ۸ء - اگست ۸ء - ستمبر ۸ء - اکتوبر ۸ء -

سنہ ۴۵ء = اپریل ۱۲ء - اگست ۸ء - ستمبر ۱۲ء - اکتوبر ۱۲ء - نومبر ۱۲ء -

سنہ ۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) عاء - اپریل تا اگست مسلسل فی کاپی ۸ء - ستمبر ۱۲ء - اکتوبر ۱۲ء - نومبر عہ ء -

سنہ ۴۷ء = جنوری (ماجد دریابادی نمبر) عاء - مارچ ۱۲ء - اگست ۱۲ء - ستمبر ۸ء - اکتوبر ۸ء - دسمبر عہ ء -

سنہ ۴۸ء = جنوری، فروری (پاکستان نمبر) ے ء - مارچ ۱۲ء - مئی ۱۲ء - جون ۸ء - جولائی ۸ء - اگست ۸ء - ستمبر عہ ء - نومبر ۱۲ء - دسمبر ۸ء -

سنہ ۴۹ء = جنوری، فروری (افسانہ نمبر) عاء - مارچ تا جولائی مسلسل فی کاپی ۸ء -

سنہ ۵۰ء = جنوری، فروری (تنقید نمبر) عاء - مارچ ۱۲ء - اپریل ۸ء - مئی ۱۲ء - جون ۸ء - جولائی ۸ء - اکتوبر عہ ء - نومبر عہ ء - دسمبر ۱۲ء

منیجر نگار - لکھنؤ

اقتباسات

آئس کریم کی قدامت

تاریخی نقطۂ نظر سے آئس کریم بڑی پرانی چیز ہے اور اب سے پانچ ہزار سال پہلے کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے۔ نیرون اور سکندر اعظم سفر و حضر، صلح و جنگ ہر موقعہ پر اس کا استعمال کرتے تھے۔

عہد قدیم میں امراء و سلاطین کے لئے آئس کریم طیار کرنا آسان نہ تھا۔ سیکڑوں غلام برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر جاکر وہاں سے کمبلوں اور نمدوں میں لپیٹ کر برف کی سلیں لاتے تھے اور دودھ، شراب اور شہد کوزوں میں بھر کر برف کے اندر ان کو اتنا گھماتے تھے کہ وہ منجمد ہو جاتے تھے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب سکندر نے ہند و سندھ اور باختر پر تاخت کی تھی تو وہ التزاماً آئس کریم کھایا کرتا تھا

سقوط روم کے وقت تک وہاں اس کا استعمال امراء کے لئے مخصوص تھا اور قرون وسطی میں پادریوں نے اس کا استعمال ناجائز قرار دیدیا۔

سب سے پہلا وہ شخص جس نے اٹلی میں اس کو زیادہ رائج کیا سیاح مارکوپولو تھا۔ اس کا بیان ہے کہ یہ صنعت اس نے اہل چین سے سیکھی تھی

چین کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ولادت مسیح سے تین ہزار سال قبل وہاں اس کا رواج عام تھا اور جب مارکوپولو وہاں پہونچا تو اس نے دیکھا کہ یہ چیز عام طور پر بازاروں میں فروخت ہوتی ہے

مارکوپولو نے یہ صنعت صرف بادشاہوں کے باورچیوں کو سکھائی اور اس کو اتنا راز میں رکھا کہ اس کے دو سو سال بعد یوروپ میں اس کی یاد بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہوگئی یہاں تک کہ جب کیتھرائن کی شادی ہنری دوم کے ساتھ ہوئی تو اس کے جہیز میں آئس کریم بنانے کا نسخہ بھی دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنری دوم کو اس سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز محبوب نہ تھی۔ وہ جاڑے گرمی ہر موسم میں اس کا استعمال کرتا تھا۔ اور اسی کے دربار سے یہ صنعت فرانس کے عوام تک پہونچی

انگلستان میں اس کے ایک صدی بعد اس کا رواج ہوا جس کی ابتدا شارل اول سے ہوتی ہے (جس کا سر پارلیمنٹ کے حکم سے قطع کیا گیا تھا) ایک دن اس نے اپنے اطالوی باورچی سے کہا کہ آج کوئی ایسی نئی چیز طیار کرو جو بہت لذیذ ہو۔ اس نے آئس کریم طیار کرکے پیش کی اور بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ اس سے حلف لیا کہ اس کا نسخہ کسی کو نہ بتائے گا۔ لیکن جس وقت جلاد نے شارل کا سر قطع کیا اور لوگ جوق در جوق تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تو اطالوی باورچی نے اس کا نسخہ گراں قیمت پر فروخت کر دیا

اس وقت امریکہ میں اس کا رواج اتنا عام و ترقی یافتہ ہے کہ اگر اسے آئس کریم کھانے والوں کا ملک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کا سالانہ صرف وہاں ۲۳ کرور گرام سے کم نہیں ہے اور وہاں کی ہر یونیورسٹی میں اس صنعت کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دیجاتی ہے

وہاں آئس کریم بازاروں کے علاوہ دواخانوں میں بھی ملتی ہے اور ایک اچھے آئس کریم بنانے والے کی تنخواہ وہاں ۷۰۰ ڈالر ماہانہ سے کم نہیں ہوتی

امریکہ میں آئس کریم بنانے کے کارخانے دیکھنے کی چیز ہیں، بڑی بڑی عمارتیں جن کا درجۂ حرارت صفر سے بھی ۵ درجے کم ہوتا ہے، طیار کی جاتی ہیں اور یہاں کام کرنے والے سردی سے محفوظ رہنے کے لئے قطب شمالی کی رہنے والی قوموں کا سا لباس پہن کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ ان کو روزانہ ۸ چمچے مچھلی کا تیل بھی دیا جاتا ہے تاکہ ان کی صحت خراب نہ ہو

امریکہ میں تقریباً ۱۰۰ قسم کی آئس کریم طیار ہوتی ہے، اور تازہ ترین اختراع اس سلسلہ میں یہ کی گئی ہے کہ آئس کریم کے کوزہ پر انڈے کی زردی

سفیدی پھینٹ کر پھیلا دیتے اور پھر اس کو ایک گرم دیگ کے اندر رکھ کر فوراً نکال لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالائی سطح تو گرم ہو جاتی ہے لیکن انڈے کی سطح کے نیچے جب چمچ جاتا ہے تو اسے وہی منجمد آئس کریم ملتی ہے

اہلِ ایران اور موسیقی

اس میں شک نہیں کہ فنِ موسیقی پر ایرانیوں نے بہت کچھ لکھا ہے اس نوع کے قدیم لٹریچر میں اسحاق موصلی (وفات ۲۲۵ھ) کی کتاب "النعیم والایقاع" اور سرخسی (۲۸۶ھ) کی کتاب "الموسیقی الکبیر" خاص شہرت رکھتی ہیں

ان کے بعد ابن خرداذبہ (وفات ۳۰۰ھ) نے ایک کتاب اسی فن پر لکھی جس کا نام "کتاب اللہو والملاہی تھا۔ مروج الذہب میں بھی ان تقریروں کا ذکر موجود ہے جو المعتمد خلیفہ عباسی کے حضور میں ابن خرداذبہ فن موسیقی پر کیا کرتا تھا۔ ان کے بعد مشہور طبیب ابوبکر رازی (وفات ۳۱۳ھ) نے بھی ایک کتاب موسیقی پر لکھی تھی اور فارابی (وفات ۳۸۷ھ) کی کتاب الموسیقی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران نے اس فن میں کتنی ترقی حاصل کی تھی جس کا ثبوت ابوعبداللہ خوارزمی کی کتاب مفاتیح العلوم سے بھی ملتا ہے

شیخ الرئیس بوعلی سینا (وفات ۴۲۸ھ) نے بھی کتاب "النجاۃ" فن موسیقی پر لکھی جو اب بھی بعض کتب خانوں میں پائی جاتی ہے

ابن سینا کے ایک شاگرد ابن زیلہ (وفات ۴۲۰ھ) کی "کتاب الکافی فی الموسیقی" کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے جس میں اس نے ایرانی و خراسانی موسیقی کا تفصیلی ذکر کیا ہے

فخرالدین رازی (وفات ۶۰۶ھ) نے بھی اصول فن موسیقی پر اپنی کتاب جامع العلوم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ رازی کے بعد ناصرالدین طوسی (وفات ۶۷۲ھ) نے عربی میں ایک رسالہ اس فن پر لکھا

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ایک بہت بڑا ماہر موسیقی صفی الدین عبدالمومن پیدا ہوا (وفات ۶۹۳ھ) اور اس نے دو کتابیں لکھیں ایک کتاب الادوار، دوسری رسالۃ الشرفیہ اس کی حیثیت ایک ٹائیک کی سی تھی جس نے ایران کی قدیم موسیقی میں بہت کچھ اضافہ کیا اور موسیقی کا ایک مستقل اسکول اس کے نام سے قایم ہوگیا۔ اس کے بتائے ہوئے اصول موسیقی کی متعدد لوگوں نے تفسیر و تشریح کی جن میں شرح مولانا مبارک شاہ (وفات ۱۸۹ھ) بہت اہمیت رکھتی ہے۔ قطب الدین شیرازی (وفات ۷۱۰ھ) نے بھی اپنی کتاب درۃ التاج میں اسی اسکول کی موسیقی کو بیان کیا ہے۔ اور محمد محمود آملی نے بھی نفائس الفنون میں اس کا ذکر کیا ہے

اسی زمانہ میں عبدالقادر بن غیبی المراغی (وفات ۸۳۸ھ) ایک اور ماہر موسیقی پیدا ہوا جو دربار تیمور و شاہرخ سے وابستہ تھا۔ حاجی خلیفہ اور شرف الدین ہزوی نے اسے اصول موسیقی کا بہت بڑا ماہر تسلیم کیا ہے، اس نے ایک کتاب فارسی میں جامع الالحان کے نام سے لکھی (۸۱۶ھ) جس کا قلمی نسخہ جامعہ آکسفورڈ کی لائبریری میں موجود ہے، اس کے علاوہ تین کتابیں مقاصد الالحان، شرح الادوار، کنز الالحان اور بھی لکھیں جن میں سے اول الذکر دو کتابیں تو محفوظ ہیں لیکن تیسری کا پتہ نہیں چلتا۔ ابن غیبی کے بعد اس کے لڑکے عبدالعزیز نے ایک کتاب نقادۃ الادوار اور اس کے پوتے نے مقاصد الادوار تصنیف کی

نویں ہجری کے بعد ایران میں کوئی بڑا ایک تو پیدا نہیں ہوا لیکن اوسط درجہ کے ماہرین دسویں اور گیارھویں ہجری میں بھی پائے جاتے تھے ان میں ایک ابوالوفا ابن سعید تھا جو اخیر عہد تیمور میں پایا جاتا تھا

اس زمانہ میں کچھ کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں بہجۃ الروح اور تعلیم النغمات کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ شمس الدین محمد سنجری کی درالنظیم، شیروانی کی فوائد الخاقانیہ، جلال الدین دوانی کی اخلاق جلالی، شہاب الدین عجمی کی علم الانغام اور احمد المسلم موصلی کی درالنقی فی فن الموسیقی بھی قابل ذکر ہیں۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی کیا حقیقت ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا - اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے - قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار۔ لکھنؤ

مراسلات

مخدومی! "نگار" کی گزشتہ اشاعت میں جناب افسر سیمابی کا مراسلہ میری نظر سے گزرا۔ مراسلہ کے صحیح مخاطب فضا صاحب ہیں۔ اور اصولاً انھیں کو اس کا جواب دینا چاہئے، لیکن نفس مضمون میں ایسی باتیں آگئی ہیں جن پر عمومیت کے ساتھ گفتگو کی جا سکتی ہے۔ مجھے فضا صاحب کی طرفداری مقصود نہیں لیکن افسر صاحب نے جس جرم کی سزا "پٹرول چھڑک کر دیا سلائی دکھانا" تجویز کی ہے، اسی جرم کے وہ خود بھی مرتکب ہوئے ہیں

تقلید، توارد، اور سرقہ معنوی اعتبار سے تین مختلف چیزیں ہیں لیکن کسی شعر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ شاعر ان تینوں میں سے کس چیز کا مرتکب ہوا ہے، دشوار امر ہے۔ کیونکہ اساتذہ کے دواوین میں بے شمار اشعار ایسے مل سکتے ہیں جن کے متعلق قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ لکھنے والے تقلید اور سرقہ کے مرتکب ہوئے ہیں یا توارد ہو گیا ہے۔ خصوصاً جذباتی اور داخلی شاعری میں جذبات اور احساسات بڑی حد تک یکسانیت کے حامل ہوتے ہیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ کسی کے شعر کو سامنے رکھ کر مشقِ سخن کرنا مذموم نہیں تصور کیا جاتا تھا بشرطیکہ لکھنے والے نے اس مضمون سے کوئی نیا پہلو پیدا کیا ہو یا اسی مضمون کو اپنے رنگ میں احسن طور پر ادا کیا ہو۔ اس سلسلہ میں افسر صاحب کے مندرجۂ ذیل بیان کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ فرماتے ہیں "اگر کوئی غالب یا اقبال کی تقلید کرتا ہے تو یہ بذاتہٖ کوئی قابل اعتراض بات نہیں بلکہ اس کے Intellectual ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اگر بہ پردۂ تقلید وہ ان کے افکار و تصورات کا خاکہ اڑاتا ہے یا بالفاظِ دیگر سرقہ کرتا ہے تو ایک ناقابل معافی جرم ہے"۔ یہ بیان کم از کم میرے لئے تو ناقابل فہم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو افسر صاحب تقلید یا سرقہ کے فرق کو نہیں سمجھتے یا ان کے ضمیر میں جو کانٹا ہے اس کی بنا پر وہ خود فریبی سے کام لے رہے ہیں۔ میں افسر صاحب سے بصد ادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ "اقبال اور غالب کی تقلید کرنے" اور ان کے "افکار و تصورات کا خاکہ اڑانے" کا وہ کیا مفہوم لیتے ہیں؟ اگر اقبال کی تقلید سے ان کی مراد اقبال کے نظریات کی پیروی ہے تو یقیناً یہ ذہین Intellectual ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اقبال کو نہ صرف سمجھنا بلکہ اس کی پیروی بھی کرنا بلاشک و شبہ بہت بڑی بات ہے لیکن یہ مدنظر رہے کہ نظریات تو مستعار لئے جا سکتے ہیں مگر طرز اور اسلوب پر ڈاکہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ "تقلید کے Intellectual ہونے کی دلیل" اُسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب کہنے کا اپنا ڈھنگ اور اپنا اسلوب ہو۔ اس کے بغیر اگر اقبال کے خیالات، اقبال ہی کی علامتوں اور اقبال ہی کے اسلوب میں بیان ہوں تو "سرقہ" میں تبدیل ہو جائے گا۔ بہترین مثال کے طور پر افسر صاحب کا بیشتر کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ — اس وقت نمونتاً صرف سات آٹھ مصرعے پیش کر رہا ہوں جو بغیر کسی کد و کاوش کے افسر صاحب کی صرف دو ایک نظموں سے لئے گئے ہیں:-

(افسر) پھر اٹھیں مشرقِ عظمیٰ کے فتنہ زاروں میں — کسی پہ فاش نہیں مرگ و زیست کا مفہوم

(اقبال) پھر اٹھیں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں — کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

(افسر) عنقا ہوئی اب مئے شبانہ — (اقبال) باقی ہے کہاں مئے شبانہ

(افسر) سکھا رہے ہیں یہ شیروں کو طرزِ روباہی — (اقبال) بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو

(افسر) وہ جس کو حق نے عطا کیا ہے سرور و جذب قلندرانہ — (اقبال) وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ

افسر:- بدل گئیں فقط غلامی سے زندگی کی تمام قدریں — اقبال:- کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

افسر:- کبھی سراغِ نگار ہستی نہ پا سکیگا رہینِ خانہ — اقبال:- اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں

اب مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر فضا صاحب اس جرم میں معتوب قرار دئے جا سکتے ہیں تو پھر افسر صاحب کیوں بری قرار دئے جائیں؟ میں اس مسئلہ کو آپ پر چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھے آپ کی ادبی دیانتداری پر کامل بھروسہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے مسایل میں ذاتی تعلقات اور مراسم سے قطعاً ہٹ کر فیصلہ کریں گے۔ مجھے حیرت ہے کہ اپنی کمزوری کے باوجود افسر صاحب نے اتنی جرأت کیسے کی؟ نفس مضمون سے قطع نظر تحریر کا انداز بھی افسر صاحب کے متعلق کوئی خوشگوار تاثر نہیں چھوڑتا۔ افسر صاحب کا ابتدائی کلام (۴۵ء ۴۶ء تک بھی) نوے فیصدی اقبال کا چربہ ہوتا تھا۔ اب بھی وہ اقبال کے چنگل سے نکل نہیں سکے ہیں، لیکن کم از کم اب ان کے کلام میں پختگی اور تھوڑی بہت انفرادیت ضرور آگئی ہے تاہم ان کا یہ مسئلہ ابھی ان کی ادبی اور ذہنی شعور کی ناپختگی ظاہر کرتا ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں آپ کے تاثرات کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمود ایاز (بنگلور)

(نگار) آپ کو معلوم ہو کہ افسر صاحب کا خط میں نے بادلِ ناخواستہ شایع کیا تھا اور قطع نظر اس سے کہ فضا صاحب پر جو الزام انھوں نے قایم کیا تھا وہ اپنی جگہ درست تھا یا نادرست، ان کی تحریر کا لب و لہجہ حد درجہ ناشایستہ و عامیانہ تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ ان کو اپنے اس طرزِ عمل کی ناپسندیدگی کا علم میرے علاوہ دوسرے حضرات کی طرف سے بھی ہو جانا چاہئے میں نے اسے شایع کر دیا تھا

آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں اور فضا ابن فیض اعظمی کے متعلق میں کبھی یہ خیال قایم نہیں کر سکتا کہ انھوں نے افسر کے کلام سے سرقہ کیا ہے

فضا صاحب نے اس وقت تک مجھے جواب میں کچھ نہیں لکھا اور میں ان کی اس خاموش سنجیدگی کی قدر کرتا ہوں۔

نگار جولائی ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے

"۵۵ سال کے بعد"

یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ:-

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

۱- دُنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا

۲- آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا

۳- آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائے گا

حجم ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

ناواقف لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسنے عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اسکو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گہوارہ سے لیکر لحد تک عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قایم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس التزام کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کی گئی ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نئی شاہراہ

(سیدہ اختر)

میری نگاہِ شوق میں "اک نئی شاہراہ" ہے ! اک نئی شاہراہ کیا ؟ اک نئی جلوہ گاہ ہے !
دیر و حرم جہاں نہیں، چشمکِ این و آں نہیں ! نغمۂ برہمن نہیں، غلغلۂ اذاں نہیں !
جس کا ہر ایک گام ہے منزلِ امن و آشتی جس میں بجز یقینِ عشق، وہم نہیں گماں نہیں !
جس میں ہیں جستجو قافلۂ حیات سے ! شام و سحر جہاں فقط تذکرۂ نجات ہے !
جس کے ہر اک نشیب میں جس کے ہر اک فراز میں اک نئی سرزمین ہے اک نئی کائنات ہے !
دیکھ وہ صاحبانِ دل محوِ خرامِ شوق ہیں ! تشنہ لبانِ جہد ہیں، بیخودِ جامِ شوق ہیں !
اُن کے پیام میں نہاں ایک نیا پیام ہے ! ایک شعورِ زیست ہے ایک صلائے عام ہے !
خطرۂ پیش و پس نہ کر آ "نئی شاہراہ" میں ! جلوے ہیں، تیرے منتظر منزلِ مہر و ماہ میں !

ٹیپو کے مزار پر !

(محمود ایاز بنگلوری)

تو نے جس خاک کے ذروں کو جہاں تاب کیا وہ زمیں آج بھی بے لعل و گہر ہے ساقی
تو نے جس شب کے اندھیروں میں اجالے ڈھونڈے وہ فضا آج بھی محرومِ سحر ہے ساقی
لیکن اس ظلمتِ پیہم سے گراں بار نہ ہو وہ ذرا دور پہ اک صبح کی تنویر بھی دیکھ
اس خانۂ تاریک سے کچھ اور پرے اپنے ہر خواب کی رنگینیٔ تعبیر بھی دیکھ

رزمؔ ردولوی :-

محیطِ عشق میں کیا جانئے حالت ہو کیا دل کی،
سفینہ دیکھئے تہ کی خبر لائے کہ ساحل کی

اسیری میں نشیمن کا زمانہ یاد کیا کرتے
قفس پر بھی جو پڑ جاتی کوئی افتاد کیا کرتے

سکوت میں ہے سکوں، خامشی میں لذت ہے
یہ اضطراب مرے دل نے کیوں پسند کیا

ہمنفس یہ عالمِ گم گشتگی کے راز ہیں
پا گیا منزل کو میں یا پا گئی منزل مجھے

مری مجبوریوں کا نام رکھ لو دوسری دُنیا
یہ کوئی فاصلہ ہے جو قفس سے آشیاں تک ہے

ابھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے کارواں اپنا
ابھی لپٹی ہوئی دامن سے گردِ کارواں تک ہے

جہانِ عشق میں بے اختیاریاں مت پوچھ
بس ایک جبر پہ کچھ اختیار باقی ہے

یہ لالہ زارِ مقتل، یہ ہوائے دامنِ قاتل
سکوں سا مل رہا ہے نیند سی معلوم ہوتی ہے

موت بھی کیا سمجھ کے آئی ہے،
یہی دن تھے بہار آنے کے

عجیب راز ہے دیدارِ دوست کا عالم
بہت ہے ایک گھڑی ساری زندگی کم ہے

اک وہ کہ دل میں آ گئے پردے الٹ کے سب
اک ہم کہ چاک اپنا گریباں نہ ہو سکا،

ڈوبنے کے لئے کچھ کم تھا نہ دریا کا بہاؤ
کیوں یہ طوفاں اُٹھا اب پار اُترنا ہے ہمیں،

شفقتؔ کاظمی :-

تیری جدائیوں کو زمانہ ہوا مگر،
دل ہے کہ سر بہ زانوئے حسرت ہے آج تک

لب پہ آیا تو سہی شکوۂ بیداد مگر
تیری آزردہ نگاہی سے حیا بھی آئی

اس سے پہلے کہ مری روح سنے مژدۂ عیش
دل ترے دردِ محبت سے لگا بھی آئی

فرق آیا نہ تری خوئے جفا میں ظالم،
رنگ کیا کیا نہ بدلتی رہی دُنیا اپنا

کاظمی ترکِ آرزو کے سوا
چارۂ انتظار کیا کرتے

عزم :- (بشیر بدر)

ہاں مرے فرض سے مجھ کو مری محبوب نہ روک
ابھی دینا ہے نئی صبح کا پیغام مجھے

پونچھ لے سرمگیں آنکھوں سے چھلکتے آنسو
یہ ترے ساتھ نہ کر دیں کہیں بدنام مجھے

ایسے پاکیزہ عزائم پہ یہ ماتم کیسا
مسکراہٹ کی ضرورت ہے بہرگام مجھے

میری محبوب بھی آلام سے گھبراتی ہے
لوگ دینے نہ لگیں یہ کہیں الزام مجھے

ہر حسیں چہرہ ہے پژمردہ، نگاہیں غمناک
توڑنا ہے یہ طلسمِ غمِ آلام مجھے

اس طرف صبحِ مسرت ہے اُدھر شامِ الم
دور کرنا ہے یہ فرقِ سحر و شام مجھے

تابکے جبہ و دستار خدائی کے نشاں
توڑ دینا ہے فسوں خیزیِ اصنام مجھے

ذہنِ انسانی کو پیہم جو ڈسے جاتے ہیں
ختم کرتے ہیں خداؤں کے وہ اوہام مجھے

اب مرے ذہن میں روشن ہے ارادوں کا چراغ
روک سکتا نہیں ظلمت کدۂ شام مجھے

ہاں مرے فرض سے مجھ کو مری محبوب نہ روک
ابھی دینا ہے نئی صبح کا پیغام مجھے

اکرم دھولیوی :-

آتی گئی بہار نکھرتا گیا چمن،
جب تک جنونِ شوق میں بالیدگی رہی

دل پریشاں ہو تو پھر راحت کہیں ملتی نہیں
عزمِ گلشن کیجئے یا قصدِ صحرا کیجئے

تمام حسرت و حرماں تمام سوز و گداز
یہی ہے اہلِ محبت کی داستانِ نیاز

جان دیدوں سختیِ منزل سے گھبرا کر قبول
روئے ناکامی مگر مجھ سے نہ دیکھا جائے گا

وہاں خزاں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا
جہاں تمہارے لبوں پر ہنسی نہیں ہوتی

کلام سرور :-

یاد آتی ہے تو اس طرح کہ رو دیتا ہوں
بھول جاتا ہوں تو ایسا کہ محبت ہی نہیں

تیرا کہلا کے بھی محروم کرم ہوں اے دوست
اس حقیقت پہ ندامت بھی ہے حیرت ہی نہیں

خوش بھی ہوں کبھی آنکھ بھی تر ہوتی ہے
ہائے کیا چیز محبت کی نظر ہوتی ہے

میرے محبوب تری شانِ تغافل کے نثار
جیسے ہو جائے بہر حال سحر ہوتی ہے

وصل کیا وصل کا امکاں بھی تصدق اس پر
وہ شبِ غم جو ترے نام سے سر ہوتی ہے

مطبوعات موصولہ

نالۂ ناشاد مجموعہ ہے جناب رام پرشاد کھوسلا ناشاد کی غزلوں اور نظموں کا۔ ناشاد مرحوم کا وطن پنجاب تھا لیکن اپنے اکتسابات علمی کے لحاظ سے وہ سارے ہندوستان کے لئے باعث فخر تھے۔ ان کی ساری زندگی تعلیم و تعلم ہی میں بسر ہوئی اور آخر دم تک علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے، وہ انگریزی کے بہت بڑے ادیب تھے اور مورخ کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اخلاق کے لحاظ سے بھی ان کی سطح عام انسانوں سے بہت بلند تھی اور تصوف کی طرف مایل ہونے کی وجہ سے وہ مذہب کی تفریق کے قایل نہ تھے۔ دیانت و امانت، خلوص و صداقت ان کی زندگی کا وہ اصول تھا جس سے وہ کبھی نہیں ہٹے اور اخوت عامہ و انسانیت پرستی ان کا نصب العین تھا جس کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پھر ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوگی، اس کا کلام بھی اسی قدر پاکیزہ ہوگا۔ اس مجموعہ کا پہلا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے جن کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا ابتذال و سوقیت سے پاک ہونا ہے۔ دوسرے حصہ میں نظمیں ہیں اور مختلف عنوانات پر ہیں

ابتدا میں ڈاکٹر سید محمود کا نہایت لبسیط مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ ناشاد کو ایک صوفی شاعر ہونا ثابت کیا ہے۔ اسکے بعد پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی نے ناشاد کی شاعری سے بحث کی ہے اور اس کی خصوصیات کو پوری طرح نمایاں کیا ہے

اس میں شک نہیں کہ ناشاد کے کلام میں بعض بڑی دلکش خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اقبال بک ڈپو پٹنہ نے اسے شایع کرکے زبان کی بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ قیمت چار روپیہ

تحقیق و تنقید مجموعہ ہے پروفیسر اختر اورینوی (پٹنہ کالج) کے پندرہ انتقادی حالات کا۔ بعض میں مخصوص حضرات کے ادب پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور بعض میں فنی، اصولی و تاریخی بحث کی گئی ہے

تاریخی حیثیت سے "بولیوں کا سنگم" بڑا اہم مقالہ ہے اور فنی حیثیت سے بھی کئی مقالے بڑی کاوش و تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ فن اور ماحول۔ افسانہ میں حقیقت طرازی۔ ڈراما فنی نقطۂ نظر سے، خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے قابل ہیں

پروفیسر اختر اورینوی بڑے مشاق اور مشہور نقاد ہیں اور ان کے مضامین کو اہل نظر بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ :- شاد بک ڈپو - پٹنہ

تنقید جدید مجموعہ ہے پروفیسر اختر اورینوی کے آٹھ انتقادی مقالات کا جو اس سے قبل ملک کے مختلف رسایل میں شایع ہو کر کافی مقبول ہو چکے ہیں اس مجموعہ کا پہلا مقالہ ترقی پسند ادب پر ہے جس میں بہت سوچ سمجھ کر ترقی پسند ادب کے حال و مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا مقالہ "ادبیات عالم اور اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات" بھی اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں زیادہ تر اصولی بحث کی گئی ہے اور از بس مفید و اہم ہے، چوتھا مقالہ "ادب میں روایات اور تبدیلیاں" بھی اس بحث سے تعلق رکھتا ہے اور اس طرح یہ تینوں مقالے مل کر "ترقی پسند ادب" پر بڑی جامع گفتگو ہو جاتے ہیں

نظیر اکبر آبادی اور غالب کے فن شاعری پر بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیالات شعر و شاعری کے متعلق کتنے سلجھے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ کی قیمت درج نہیں ہے۔ لیکن غالباً تین روپیہ ہوگی۔ ملنے کا پتہ : شاد بک ڈپو پٹنہ

کلیات اکبر جلد اول بزم اکبر کراچی کی عملی کوشش کا یہ پہلا نتیجہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اور اس میں اکبر کی شاعری کے مختلف ادوار قایم کرکے ان کے کلام کو مرتب کیا گیا ہے۔ پہلے دور میں سترہ سال سے ۳۰ سال

کی عمر تک کا کلام ہے، دوسرے دور میں ۳۰ سے ۴۰ سال عمر تک کی غزلیں ہیں، تیسرے دور میں ۴۰ سے ۵۰ سال عمر تک کلام ہے۔ اخیر میں انکی رباعیات اور قطعات وغیرہ دئے گئے ہیں

کتابت وطباعت میں کافی نفاست کا خیال رکھا گیا ہے اور کاغذ بھی بہت اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ جلد بھی نہایت خوبصورت ومضبوط ہے قیمت چھ روپیہ ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات ۔ ملنے کا پتہ : بزم اکبر کراچی

اُردو جناب جگن ناتھ آزاد کی ایک طویل نظم ہے جو انھوں نے اُردو مجلس دہلی کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں ۱۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو پڑھی تھی۔

جناب آزاد نے ایک کامیاب شاعر ہونے کے لحاظ سے جو شہرت حاصل کی ہے، اس کی بنیاد چند درچند خصوصیات پر قایم ہے جن کا تعلق فن سے بھی ہے اور ان کی ذات سے بھی۔ فن کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ایسے پختہ کار شاعر ہیں کہ مشکل ہی سے دو چار ان کی صف میں آسکتے ہیں، لیکن جس حد تک انکی ذات یا ذاتی تاثرات کی بلندی کا تعلق ہے، دو چار بھی ایسے نہ ملیں گے کہ آزاد کے نام کے ساتھ ان کا نام لیا جائے۔ آزاد کی شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم یکسر دردمندانہ خلوص کا اظہار ہے اور اس اظہار میں وہ ان تمام سلیقوں سے کام لیتے ہیں اور جو قدیم وجدید اُردو ادب کے مطالعہ سے ان میں پیدا ہوا ہے

اس نظم میں انھوں نے جو کچھ اُردو زبان کے متعلق لکھا ہے وہ بحالات موجودہ ایک "شہر آشوب" کی صورت رکھتا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا خلوص اور ان کی دردمندی ظاہر ہے۔ قیمت ۲ ملنے کا پتہ : دہلی کتاب گھر دہلی

شانِ محفل مجموعہ ہے منشی رگھوناتھ سنگھ ہاجر دہلوی کی غزلوں کا۔ ہاجر صاحب اب سے ۳۰ سال قبل کے شاعر ہیں، جب دہلی کے ہندو مسلمان دونوں ایک ہی کلچر رکھتے تھے اور زندگی کے مسایل کو خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے

جناب ہاجر ایک معزز کھتری خاندان کے فرد تھے اور اس عہد کے رواج کے مطابق فارسی کی تعلیم سے ناآشنا نہ تھے، اسی لئے ان کی زبان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک پڑھے لکھے شاعر کے کلام میں پائی جانا چاہئے

ان کے تغزل کی زبان وہی ہے جو دہلی کے اونچے معزز خاندانوں میں رائج تھی اور انداز بیان میں بھی وہی سلاست وصفائی پائی جاتی ہے جو ایک زباندان کے کلام میں ہونا چاہئے ۔ اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ ہے ۔ ملنے کا پتہ: کویراج رگھنندن سنگھ ساحر کناری بازار دہلی

آزادی کے بعد ترجمہ ہے Howard Fast کی کتاب Freedom Road کا، ہاورڈ فاسٹ امریکہ کا بڑا مشہور ناول نگار ہے اور اس کی اکثر کتابوں کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اُردو میں غالباً یہ بالکل پہلی اور بڑی کامیاب کوشش ہے۔ ہاورڈ فاسٹ باوصف امریکن ہونے کے، موجودہ امریکی ذہنیت کا سخت مخالف ہے اور وہ امریکہ کی جمہوریت کو جو اس کے نزدیک فاسسٹیت ہی کی دوسری صورت ہے۔ بہت بری نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی لئے حکومت نے اسے نظر بند کر دیا ہے۔ وہ امریکہ کے اس فلسفہ کا قایل نہیں کہ شائستگی وتہذیب نام ہے صرف ڈالر اور آٹم بم کا، بلکہ وہ تہذیب کی بنیاد اس جذبۂ انسانیت کو قرار دیتا ہے جو نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھے ۔ ہاورڈ فاسٹ کا انداز بیان بہت عجیب ہے اور ترجمہ میں اس کا باقی رکھنا آسان نہ تھا، لیکن اس کے فاضل مترجم احسن علی خاں قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اصل کتاب کے طرز ادا کی خوبیوں کو قایم رکھتے ہوئے اس قدر سلیس وصاف ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ حجم ۲۲۴ صفحات ۔ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ :۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی

خاورستان مجموعہ ہے جناب افسر سیمابی احمد نگری کی نظموں کا جسے خود انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔

افسر صاحب کے رنگ سخن کے متعلق کسی تفصیلی اظہار خیال کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کا کلام اکثر نگار میں شایع ہوتا رہتا ہے اور کافی پسند کیا جاتا ہے ۔ افسر صاحب نے ابتدا ہی سے اقبال کے رنگ میں لکھنا شروع کیا اور اس وقت تک استقلال کے ساتھ اس پر قایم ہیں۔

شکوہ الفاظ، حسن تراکیب، بلندی خیال اور فنی رکھ رکھاؤ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس مجموعہ میں ان کی ۱۳۵ نظمیں شامل ہیں اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر نہایت دیدہ زیب طباعت وکتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہیں۔

قیمت چھ روپیہ ۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات ۔ ملنے کا پتہ : افسر سیمابی ۔ جلیس منزل ۔ احمد نگر

نگار کی پرانی مکمل جلدیں

۳۱ء	۳۲ء	۳۵ء	۳۶ء
۱۵ء	۱۵ء	۱۵ء	۱۵ء
۳۷ء	۴۷ء	۵۰ء	
۱۵ء	۱۰ء	۱۰ء	

منیجر نگار

تنقیدی اشارے

پروفیسر آل احمد سرور - ریڈر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے - پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سند کی حیثیت رکھتے ہیں - ضخامت ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول - منیجر نگار - لکھنؤ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس
کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں - دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمائیے اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے، ایک شیشی چھ سات سیر خون آپکے جسم میں اضافہ کر دیگی اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی - یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی - یہ دوا نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں - یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی - تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے

قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک چار روپیہ (للعہ ر)

نوٹ :- فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس - فہرست دواخانہ مفت منگائیے میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے - نقالوں سے ہوشیار رہئے میری ۳۱ سالہ شہرت پر غور فرمائیے

پتہ:- **حکیم ثابت علی شیخ زبان خوش کلام**
(عالم ثمنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر نمبر ۳ لکھنؤ - یو - پی

جن بچوں کو
بڑا ہو کر اس دنیا کا بوجھ اٹھانا ہے
ان کی پرورش "نونہال" پر ہونی چاہیئے

نونہال

ننھے بچوں کو مضبوط بنانیوالا
ان کا دل پسند ٹانک

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

Hamdard

دی مغل لاین لمیٹیڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن ، جدّہ ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارسن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ - بمبئی

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل، اس کی نزاکتِ بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا حالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مادیین کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانۂ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے:-

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سمِ قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشار کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے

ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر۔ فارسی زبان کی پیدائش پر مؤخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصولِ نقد فنونِ ادبیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

Regd. No. A466

نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری۔مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد دلین نمبر" ہے جس میں ایک بےمثیل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دو زرین کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈسن" کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ

جولائی ۱۹۵۱ء

ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ہے "۵۵ سال کے بعد" یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپنے سمجھ لیا تو پھر (۱) دنیا کا ہر رنج دالم آپ کیلئے بے معنی ہو جائے گا (۲) آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا (۳) آپ کی عمر طبیعی کا معیار بالکل بدل جائیگا (۴) انحطاط عمر اور ضعیفی کا موجودہ مفہوم قطعی باقی نہ رہے گا۔ (۵) شاہراہ حیات پر چلنے کا وہ طریقہ آپکو معلوم ہو جائیگا جو اسوقت تک آپکی آنکھوں سے اوجھل تھا قیمت ۱۲ عہ

سالنامہ ۱۹۲۸ء

مومن نمبر

جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول